# کلامِ نور

## کے ادبی محاسن

فصاحت و بلاغت
صنائع و بدائع
تشبیہ
استعارہ
علم بیان
محاورے
صنعت تلمیح
کنایہ

محمد طفیل احمد مصباحی

باسمہٖ تعالیٰ

نازش فکر وفن سید الشعراء جناب سید نور الحسن نورؔ نوابی عزیزی دام ظلہ کی نعتیہ شاعری کی فنی خصوصیات اور ان کے کلام کے ادبی محاسن کا تجزیاتی مطالعہ

# کلام نور کے ادبی محاسن

مصنف

مولانا محمد طفیل احمد مصباحی

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | کلام نور کے ادبی محاسن |
| مصنف | : | محمد طفیل احمد مصباحی |
| کمپوزنگ | : | محمد طفیل احمد مصباحی |
| تزئین | : | محمد محفوظ عالم صدف بھاگل پوری |
| صفحات | : | 237 |
| قیمت | : | ایک سو پچاس روپے (150) |
| سالِ اشاعت | : | رجب المرجب ۱۴۴۱ھ مارچ ۲۰۲۰ء |
| ناشر | : | علماء کونسل، بانکا (بھاگل پور، بہار) |


## ملنے کے پتے

(۱) محمد طفیل احمد مصباحی، سبحان پور کٹوریہ، عمر پور، ضلع بانکا، (بھاگل پور) بہار

(۲) مفتی محمد مستقیم احمد احسن، ضلع سکریٹری علماء کونسل، بانکا، بہار

(۳) مولانا قاری غفران احمد رضوی، مکتبہ اعلیٰ حضرت، ضلع سیوان، بہار

(۴) مولانا قاری محمد عمر دانش برکاتی، دارالعلوم تاج المدارس، سمبل پور، اڑیسہ

کتاب حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل نمبر پر رابطہ کریں :

7905380562 / 9415494492 / 7061672959

# فہرست موضوعات

## ﴿پیش لفظ﴾

شاعری، داخلی و خارجی عوارض و کیفیات کا جمالیاتی اظہار ہے۔ شاعری کا اصل حسن، اس کے معنوی پہلوؤں میں مضمر ہے۔ تاہم اس کا ظاہری حسن بھی بڑی اہمیت کا حامل ہوا کرتا ہے۔ نازشِ فکر وفن، استاذ الشعراء جناب سید محمد نور الحسن نور نوّابی عزیزی دام ظلہ کی شاعری اور بالخصوص نعتیہ شاعری ’’قدیم صالح اور جدید نافع‘‘ کا ایک حسین سنگم ہے، جس میں خالص ادبی نقطہ نظر اور فنی زاویہ نگاہ سے بہت سارے محاسن اور شعری خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ’’کلامِ نور کے ادبی محاسن‘‘ میں موصوف کی نعتیہ شاعری کے انہیں ظاہری و معنوی اوصاف و خصوصیات کا ایک تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی ناتمام کوشش کی گئی ہے۔ کسی عظیم شاعر کے فکر وفن کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینا، ناقد کا کام ہے، راقم نہ کوئی ناقد ہے اور نہ سخن فہم و سخن شناس۔ محض ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہے اور اسی حیثیت سے ادب و فن کے تناظر میں ’’کلامِ نور‘‘ کو دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اپنا حاصلِ مطالعہ قارئین کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اختلافِ رائے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے۔ اہلِ علم و ادب کی بارگاہ میں مؤدّبانہ گذارش ہے کہ کتاب میں اگر لفظی و معنوی خامیاں راہ پا گئی ہوں تو راقم کو اطلاع کریں، تاکہ ان کی اصلاح کی جا سکے۔

اخیر میں پیکرِ علم و ادب، سفیرِ نعت، جناب سید صبیح رحمانی (مدیر نعت رنگ، لاہور) اور ادیبِ عصر جناب ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنے گراں قدر تاثرات سے کتاب کو سندِ وقار و اعتبار بخشا۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے ان دونوں کے عمر و اقبال میں بے پناہ برکت عطا فرمائے اور دارین کی سعادتوں سے مالا مال کرے۔ آمین

محمد طفیل احمد مصباحی

۲۹ر جنوری ۲۰۲۰ء، بروز جمعرات

# بشرف انتساب

## ﴿الف﴾

نعتیہ ادب کے فروغ و استحکام میں کوشاں رہنے والے اور نعتیہ شاعری میں اپنے فکر وفن کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنے والے ان شاہین صفت احباب کے نام جن کا مقصدِ حیات نبی اکرم، رحمتِ عالم، نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی توصیف وثنا خوانی اور صنفِ نعت پاک کا احیا وارتقا ہے۔

## ﴿ب﴾

**والدین کریمین کے نام** :

جن کی تعلیم وتربیت نے اس گنہگار بیٹے کو قلم پکڑنے کا شعور بخشا۔ اللہ تعالیٰ حضراتِ پنجتن پاک کے صدقے ان کے عمر و اقبال میں بے پناہ برکتیں عطا فرمائے۔ آمین!

"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

محمد طفیل احمد مصباحی

# تاثراتِ مشاہد

مولانا طفیل احمد مصباحی ایک فعال اور متحرک جواں سال شاعر اور قلم کار ہیں۔ جن کے قلم کی جولانی نثر و نظم کے میدان میں مسلسل اپنا رنگ بکھیر رہی ہے۔ ان کی زنبیلِ حیات میں کئی اہم موضوعات پر مشتمل کتب و رسائل جگمگا رہی ہیں۔ انھوں نے صاف وشفاف مذہبی صحافت میں بھی اچھا نقش مرتب کیا ہے۔ آج کل ادب کے جزائر کی سیاحی میں مصروف ہیں۔ انھیں مذہب اور ادب دونوں سے یکساں لگاؤ ہے، خصوصاً نعتیہ ادب سے انھیں حد درجہ دلچسپی ہے۔

زیرِ نظر کتاب: ''کلامِ نور کے ادبی محاسن'' اسی ذوق وشوق کے نتیجے میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ جناب سید نورالحسن نور نوابی عزیزی معاصر نعت نگاروں میں ایک سب رنگ اور خوش فکر نعت گو شاعر ہیں، جن کا زرنگار قلم مدحت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے گلستانِ عقیدت میں نت نئی اور خوب صورت فصلیں مسلسل لہلہا رہا ہے۔ نور صاحب کی شعری کائنات خود آگہی اور خدا آگہی کے آفاقی تصورات سے ہم آہنگ نظر آتی ہے، جس میں خارجیت اور داخلیت دونوں کی گہری آمیزش بھی ہے اور شعریت کے حسن وکمال کے ساتھ ساتھ عشقِ رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کا تقدس اور جمال بھی۔ عشق ومحبت کی محتاط وارفتگی ان کی نعتوں کی زیریں رَو میں پنہاں نظر آتی ہے۔

ایسے باکمال شاعرِ نعت کے کلام کی خصوصیات اور ادبی محاسن کا تجزیہ طفیل احمد مصباحی صاحب نے اس کتاب میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ طفیل احمد مصباحی نے نور صاحب کے خاندان اور ان کے

رخِ حیات کی مختصر جھلکیاں بھی اس میں سجا دی ہیں تا کہ قاری کے سامنے شاعرِ محترم کا شب و روز بھی آ جائے۔ اس کے بعد انہوں نے شاعری کی تعریف اور اس کے جملہ محاسن کا بیان کرتے ہوئے جناب نورالحسن نور کی شعری کائنات کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔ ہر بات مدلل انداز میں پیش کی گئی ہے اور کلامِ نور کا ادبی تجزیہ کرتے وقت جا بجا دلائل و براہین کا سہارا لیا گیا ہے اور مختلف ناقدینِ فن اور محققین کی آرا سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حسبِ ضرورت نور صاحب کی شاعری پر ادبا کے تاثرات بھی نقل کیے گئے ہیں۔

مصنف نے بڑے عمدہ اسلوب اور دلنشیں پیرایۂ بیان میں کلامِ نور کے ادبی محاسن کو اجاگر کرتے ہوئے سلاست و سادگی، ایجاز و اختصار، فصاحت و بلاغت، معنی آفرینی، محاورات کا استعمال، تشبیہات، استعارات، تراکیب اور صنائع لفظی و معنوی کے ساتھ پیرایۂ اظہار و اسلوبِ ادا اور دیگر فنی محاسن کو مبرہن کیا ہے۔ کلامِ نور میں قرآنی آیات اور احادیث و سیرت کی آمیزش کے جائزے سے بھی یہ کتاب آراستہ ہے۔ البتہ کہیں کہیں طفیل احمد مصباحی کی اپنے ممدوح سے متعلق گہری عقیدت کے غلبے کا شائبہ بھی دکھائی دیتا ہے، جو دراصل تاثراتی تنقید کا نتیجہ ہے اور یہ انداز و اسلوب اردو کے متعدد ناقدین کے یہاں پایا جاتا ہے۔ خیر موصوف کے اس اسلوبِ اظہار پر ناقدینِ ادب کو اپنے آراء کے اظہار کا حق پہنچتا ہے، جس کا عندیہ مصنفِ کتاب نے ''پیش لفظ'' میں ظاہر کر دیا ہے۔

اس ادبی جائزے سے جہاں سید نور صاحب کے فکر و فن کا جمال ہمیں شاد کام کرتا ہے، وہیں مصنف کی وسعتِ مطالعہ اور ان کے ایک اچھے تحقیقی ذہن کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ طفیل احمد مصباحی کی یہ کاوش زبان و بیان

کی پختگی، پیرایۂ بیان کی شگفتگی، تجزیے کی عمدگی، حُسنِ ترتیب کی طرفگی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے ایک ایسی کارآمد اور مفید کتاب ہے، جسے یونیورسیٹی سطح پر لکھے جانے والے ایم. فل. کے مقالات سے بھی قدرے بہتر قرار دیا جاسکتا ہے۔ راقم ممدوحِ کتاب اور صاحبِ کتاب دونوں کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔

**ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی**
مالیگاؤں، مہاراشٹر

☆☆☆

# کلماتِ تحسین و تبریک

سید نور الحسن نور نوابی ہمارے عہد کے نعتیہ منظر نامے پر اپنی دل کشا تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ان کے متعدد نعتیہ مجموعے میرے مطالعے میں رہے ہیں۔صنف نعت میں ان کا والہانہ تخلیقی وفور اس امر کا گواہ ہے کہ انہیں ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے کس درجہ عقیدت ومحبت ہے۔ان کے کلام میں جذبے کی سرشاری،فکری علویت، خیال کی ندرت اور زبان کی شگفتگی کا خوب صورت امتزاج قاری کے قلب و روح کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

اس وقت میرے پیش نظر ''کلام نور کے ادبی محاسن'' کا مسودہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اردو نعت کے اس اہم اور قادر الکلام نعت گو شاعر کے فکر وفن پر عزیزم مولانا طفیل احمد مصباحی نے ایک بھرپور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔اس سے پہلے بھی ان کی بعض تحریریں میری نظر سے گزری ہیں۔وہ مشرقی شعری روایت کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور شاعری کے فنی اسرار و رموز سے بھی آشنا ہیں۔''کلام نور کے ادبی محاسن'' میں انہوں نے کلام کے شعری وفکری محاسن پر صراحت کے ساتھ گفتگو کی ہے اور بعض نکات کی بہتر تفہیم کے لیے اساتذۂ سخن کے کلام سے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ اس کتاب میں ''تخیل ومحاکات'' اور مضمون آفرینی ومعنی آفرینی کے باب میں کی جانے والی گفتگو اور اس کے ضمن میں پیش کیے گئے دلائل نے خاص طور پر مجھے اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ مجموعی اعتبار سے طفیل مصباحی کا یہ تجزیاتی مطالعہ کسی

شاعر کے فکر وفن کو اہل علم کے سامنے سلیقے سے پیش کرنے کی کامیاب کوشش ہے، جس پر صاحبِ کتاب وصاحبِ فن دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ طفیل مصباحی اپنے علمی ذوق کو مزید صیقل کرتے ہوئے آئندہ کتابوں میں تنقیدی سطح پر معروضیت کی اہمیت کو پیش نظر رکھیں گے اور اپنے تنقیدی شعور کو نکھارتے ہوئے نقد ونظر اور تحقیق کی دنیا میں بڑے کام کریں گے۔ میں ان کے بہتر مستقبل کے لیے دعا گو ہوں۔

سید صبیح رحمانی
مدیر ''نعت رنگ'' کراچی، پاکستان

☆☆☆

## سید محمد نور الحسن نور نوّابی عزیزی :

جناب سید محمد نور الحسن نور نوابی عزیزی کے جدِّ اعلیٰ حضرت سید برہان الدّین شہید چشتی ہتھگانوی علیہ الرحمہ، سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز علیہ الرحمہ کے سگے خالہ زاد بھائی تھے۔فخر السالکین، سلطان العارفین، عاشق سید المرسلین حضرت الحاج صوفی سید نوّاب علی شاہ حسنی جہاں گیری ابوالعلائی علیہ الرحمہ، سید برہان الدین شہید ہتھگانوی کے خاندان کے ایک بطل جلیل، سلطان الاولیا خواجہ محمد حسن میاں کے لائق و فائق اورمحبوبِ نظرمریداورسلسلہ عالیہ جہانگیریہ کےانمول رتن ہیں۔ان کی تبلیغی سرگرمیوں اور اصلاحی کاوشوں کی بدولت بے شمار افراد کو ہدایت و سعادت کی زندگی نصیب ہوئی اور کافی تعداد میں ہندواورسکھ آپ کے دستِ حق پرست پر مشرّف بہ اسلام ہوئے۔

عارفِ باللہ حضرت الحاج صوفی سید نوّاب علی شاہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تین صاحب زادے ہیں اور ماشاءاللہ تینوں لائق و فائق، علم و ادب کے شیدائی اور تصوّف و معرفت کے ادا شناس ہیں۔سید نور الحسن نور نوابی عزیزی کا آبائی وطن قاضی پور شریف، ضلع فتح پور (ہسوہ)، یوپی ہے۔یکم رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ، بمطابق ۲۴/جون ۱۹۸۲ء کو یہیں ان کی پیدائش ہوئی۔اپنے والد ماجد اور برادر اکبر سے تعلیم و تربیت حاصل کی اور نازشِ علم و ادب ثابت ہوئے۔

## سیرت و کردار :

جناب سید نور الحسن نور نوّ ابی عزیزی دام ظلہ علم و عمل اور اخلاص کے مثلّث ہیں۔ سیادت و نجابت اور تہذیب و شرافت کے معاملے میں اپنے آباء واجداد کی روش پر گامزن ہیں۔ حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ عاجزی و انکساری، خوش مزاجی و خندہ روئی، علم دوستی و علماء نوازی، دینی تڑپ اور ملّی جذبہ، ان کی کتابِ زندگی کے درخشاں ابواب ہیں۔ دینیات کا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ اردو زبان و ادب اور بالخصوص نعتیہ ادب کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ادبی حلقے میں ادیبِ عصر اور جدّت طراز شاعر کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں اور برّ صغیر ہند و پاک کے نعت گو شعرا میں منفرد لب و لہجہ اور امتیازی حیثیت رکھنے والے ایک قادر الکلام اور پر گو شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔

## شعر و شاعری :

سید نور الحسن نور کی تعلیم و تربیت ایک ایسے خانقاہی ماحول میں ہوئی، جہاں شروع سے علم و حکمت، تصوف و معرفت اور شعر و سخن کا بڑا چرچا تھا۔ آپ کے والدِ گرامی سراج العارفین، برہان الواصلین، فخر السالکین حضرت الحاج صوفی سید نوّاب علی شاہ حسنی جہاں گیری ابوالعلائی علیہ الرحمہ سچے عاشقِ رسول و عاشقِ نعت تھے۔ انہوں نے خود کو اپنے آقا جناب محمد مصطفیٰ

صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں فنا کر دیا تھا۔ خلوت وجلوت اور سفر وحضر میں ہمیشہ نامِ نبی اور نعت رسول ان کی زبان پر جاری رہتی۔ نعت پاک سے اتنا شغف اور ایسی والہانہ شیفتگی تھی کہ اپنے مریدوں سے فرمایا کرتے کہ ''اگر مجھے خوش کرنا چاہتے ہو تو مجھے نعت سناؤ''۔ جس خانقاہ میں نعت رسول سے ایسی وابستگی پائی جاتی ہو، وہاں ''نعت گوئی'' کے پودے کا تناور درخت کی شکل اختیار کر لینا ایک فطری امر ہے۔ صوفی سید نواب علی شاہ علیہ الرحمہ کی بے مثال تعلیم و تربیت کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کے تینوں صاحب زادگان علم و حکمت اور فضل و کمال میں ممتاز ہیں۔ بڑے صاحب زادے فخر الاتقیاء ، رہبرِ شریعت و طریقت حضرت صوفی سید محمد عزیز الحسن شاہ عزیزؔ نوابی لیاقتی دام ظلہ سجادہ نشین آستانہ عالیہ نوابیہ قاضی پور شریف علم و حکمت، دین و دانش، فضل و کمال اور شعر و سخن میں اعلیٰ مقام و منصب پر فائز ہیں۔ نیز اردو و فارسی کے قادر الکلام شاعر ہیں۔ چھوٹے صاحب زادے جناب سید محمد مجیب الحسن مجیب نوابی دام ظلہ ایک اعلیٰ عصری تعلیم یافتہ انسان ہیں۔ دینیات کے علاوہ ادبیات سے کافی شغف رکھتے ہیں اور شعر و سخن کے معاملے میں اپنے برادران ذی وقار کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں۔ اچھی شاعری کرتے ہیں۔ ایک سال پیشتر ان کا مجموعہ نعت و منقبت ''بامِ ایجاب'' منظر عام پہ آ کر قارئین سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔

جناب سید محمد نور الحسن نور نوابی دام ظلہ، سید نواب علی شاہ علیہ الرحمہ کے منجھلے صاحب زادے ہیں اور ''خیر الاموراوسطھا'' کے مصداق علم و فضل میں کامل واکمل ہیں۔ شعر و ادب اور تصوف کی دولت وراثت میں پائی ہے۔ ابتداءً اپنے برادر اکبر سے اپنے کلام کی اصلاح لیتے رہے اور بہت جلد ایک

باکمال شاعر کی حیثیت سے ابھرے۔اس وقت ان کا شمار ملک کے ممتاز اور قادرالکلام شعراء میں ہوتا ہے۔ ہرفن مولیٰ ہیں۔حمد،نعت،منقبت،غزل، رباعی، قطعات، سلام اور نعتیہ ہائیکو جیسی اصنافِ سخن میں خوب خوب طبع آزمائی کرتے ہیں۔علمِ عروض میں ایسی مہارت حاصل ہے کہ ''اساتذہ سخن'' میں ان کا نام بڑے ادب واحترام سے لیا جاتا ہے۔ بڑے زود نویس اور سیّال قلم کے مالک ہیں۔ابھی حال ہی غالب ومیر کی غزلیہ زمین میں تحریر کردہ ان کے دو نعتیہ مجموعے ''ثنا کی نکہتیں'' اور ''نعتوں کے دیئے'' شائع ہوئے اور علمی وادبی حلقوں میں کافی سراہے گئے اور بڑے بڑے اساتذہ سخن نے ان کی شعری عظمت کا اعتراف کیا۔ان کی شعری وادبی فتوحات کا دائرہ وسیع ہے۔اب تک ہندو پاک کے کئی نامور ادباء وعلماء ان کی شعری وادبی نگارشات کو خراج تحسین پیش کر چکے ہیں۔

## نعت گوئی :

سید نورالحسن صاحب کی شاعرانہ عظمت اورمہارتِ نعت گوئی کا ایک جہاں قائل ہے۔ان کی تہہ دار فکر وشخصیت اورنعتیہ شاعری پر اب تک درجنوں مضامین ومقالات لکھے جاچکے ہیں۔ راقم کا موضوعِ سخن کلامِ نور کے ''ادبی وفنی محاسن'' کا اظہار ہے۔اس لیے ان کی نعت گوئی پر زیادہ تفصیلی گفتگو کرنے کے بجائے صرف اس کے تین پہلوؤں پر روشنی ڈال کر اصل موضوع کی طرف پلٹتا ہوں۔موصوف کی نعتیہ شاعری کا مطالعہ کرنے بعد راقم اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ان کی نعت میں تین چیزیں کافی اہمیت کی حامل ہیں:

(۱) فنائیت کی حد تک صنف نعت گوئی سے انہماک (۲) وفورِ جذبات وقرینہ اظہار (۳) موضوعات کا تنوّع

ان کی شاعری اور بالخصوص نعتیہ شاعری میں زبان و بیان کی وہ تمام ادبی خصوصیات موجود ہیں، جو ایک قادر الکلام شاعر کے فن پارے میں ہوا کرتی ہیں۔ فطری ملکہ شعری گوئی نے آج ان کے فکر و تخیّل کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔ فصاحت و بلاغت، معنیٰ آفرینی، تشبیہ و استعارہ، حسنِ الفاظ و معانی، صنائع و بدائع اور اسلوبِ بیان کی سحر انگیز جدت و ندرت ان کے کلام کی پیشانی کے جھومر ہیں۔ قرینہ اظہار (جس کو نعتیہ شاعری میں اوّلیت اور امتیازی حیثیت حاصل ہے) کے فن سے کما حقہ آشنا ہیں اور اس کا سہارا لے کر اپنے کلام کو فکر و فن کا اعلیٰ نمونہ بنا دیتے ہیں اور یہ ثمرہ ہے اس جذبہ عشقِ رسول و ذوقِ نعت گوئی کا جو ان کے طاقِ دل میں شمع بن کر فروزاں ہے۔ جناب یاور وارثی کے بقول: ''حضرت نور کو عشقِ رسالت اور نعت گوئی کی سعادت ارزانی نے فن کی ان بلندیوں پر پہنچا دیا ہے، جہاں دیکھنے میں اہلِ نظر کی ٹوپیاں زمین پر آجاتی ہیں''۔ (قلزم نور، ص:۳۲)

شعر و سخن کی دنیا میں اس وقت ان کی شناخت ایک جلیل القدر نعت گو شاعر کے طور پر ہوتی ہے۔ انہوں نے نعت گوئی کے ساتھ ایسی گہری وابستگی اور شدید انہماک دکھایا ہے کہ ان کا نام اور صنفِ نعت گوئی دونوں لازم و ملزوم بن گئے ہیں۔ عصر حاضر کے نعت گو شعراء میں سید نور صاحب اس حیثیت سے قابل ذکر ہے ہیں کہ انہوں نے صحیح معنوں میں صنفِ نعت کو شاعرانہ حسن آفرینی کے ساتھ شانِ برگزیدگی عطا کی ہے۔ وہ نعت گوئی کے فنی اور شرعی تقاضوں سے واقف ہیں، اسی لیے ان کے یہاں حزم و احتیاط اور اعتدال و

توازن پایا جاتا ہے۔ آدابِ فن کے التزام کے ساتھ معنوی گہرائی، صفائیِ زبان و بیان اور اسلوبِ نگارش کی عمدگی نے ان کی شاعری میں ساحری کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ان کی شعری نگارشات میں ثنا کی نکہتیں (نعوت بر زمین غالب)، مطلعِ نور، نعتوں کے دیئے (نعوت بر زمین میر تقی میر) قلزم نور اور مرکزِ نور شاعرانہ حسن کاری کے بہترین نمونے ہیں۔

سید نور صاحب کی شاعرانہ عظمت اور ان کے اعلیٰ فکر وفن کا اعتراف ملک کی نامور یونیورسٹیز کے اساتذہ وفضلاء تک نے کیا ہے، جن میں پروفیسر بدر الدین شبنم بھاگل پوری، پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید، پروفیسر عبد الحمید اکبر، پروفیسر فاروق احمد صدیقی وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر بدر الدین شبنم کا یہ مبنی بر حقیقت تبصرہ ملاحظہ کریں:

جناب سید نور الحسن نور کی تہہ دار فکر وشخصیت میں علم وفن اور شعر وسخن کی تمام رعنائیاں اور دلفریبیاں موجود ہیں۔ ان کی شاعری ایک کامیاب اور باکمال شاعری کا نمونہ ہے۔ نعتیہ شاعری ان کا خاص میدان ہے، جس میں وہ ایک قادر الکلام نعت گو شاعر کی حیثیت سے اپنی فتح ونصرت کا پرچم لہراتے ہوئے مسلسل آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور اپنے معاصر شعراء کو پیچھے چھوڑتے جا رہے ہیں۔ ان کے متعدد نعتیہ مجموعے مطلعِ نور، قلزم نور اور غالب کی زمین میں نعتیہ مجموعہ ''ثنا کی نکہتیں'' ہمارے دعویٰ کی روشن دلیل ہیں۔ علاوہ ازیں شاعر موصوف نے شاعری کی مختلف اصناف مثلاً: غزل، نظم، رباعی، قطعات، مناقب اور سلام وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن نعت گوئی میں وہ سب سے منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کی شان اقدس میں نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ نعتیہ کلام زیبِ قرطاس کر کے نعتیہ شاعری کو ایک نیا رخ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شعری و ادبی حلقے میں ''شاعرِ جدت طراز'' کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ آپ کا نعتیہ کلام عشق وعقیدت سے لبریز ہوا کرتا ہے اور قارئین و سامعین پر ایک عجیب دلکش اور روحانی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ عشقِ رسول کی حلاوت، زبان و بیان کی چاشنی، طرزِ ادا کا نیا پن اور شیفتگی و ربودگی ان کے کلام کی سطر سطر سے مترشح ہوتی ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری میں عقیدہ وعقیدت کے ساتھ اعلیٰ فکر و تخیّل، معنیٰ آفرینی، ندرت اظہار، طرزِ ادا کا بانکپن، ترکیب سازی، پیکر تراشی اور صنائع و بدائع جیسے قیمتی موتے بکھرے نظر آتے ہیں اور قارئین کو تسکینِ قلب و روح کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ (ثنا کی نکہتیں، ص: ۲۵-۲۶)

## سید نور صاحب: فنافی النعت کی حیثیت سے :

بنیادی طور پر نعت کی تین قسمیں ہیں :- (۱) رسمی نعت (۲) حقیقی نعت (۳) اصلاحی یا تعمیری نعت۔

رسمی نعت سے مراد محض حصولِ برکت کے لئے تبرکاً لکھی گئی نعت ہے، جو بالعموم قدیم اساتذہ سخن کے دواوین وکلّیات کے شروع میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ حقیقی نعت یہ ہے کہ مطلع سے لے کر مقطع تک کلی طور پر جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف بیان ہوئی ہو۔ اصلاحی یا تعمیری نعت سے مراد وہ بامقصد اصلاحی کلام ہے جس سے فرد اور اسلامی معاشرے کی تہذیب ہو سکے۔

بعد میں نعتیہ ادب کے محققین نے نعت کی مندرجہ ذیل انواع و اقسام بیان کیے ہیں:

(۱) ضمنی وثانوی نعت (۲) رسمی وروایتی نعت (۳) معیاری نعت (۴) غیر معیاری نعت (۵) مقصدی نعت (۶) سوانحی نعت (۷) درود و سلام پر مشتمل نعت

مندرجہ بالا اقسامِ نعت کے حوالے سے جب ہم سید نور صاحب کے نعتیہ کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں ہمیں صرف ''حقیقی معیاری اور مقصدی نعت'' کے نقوش نظر آتے ہیں۔

البتہ کہیں کہیں اصلاحی اور تعمیری نعت کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں، جس کا واحد مقصد'' بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل'' ہے۔ موجودہ نعتیہ شاعری میں موصوف کی حیثیت چوں کہ ''فنا فی النعت'' کی ہے، اس لئے ''حقیقی معیاری اور مقصدی نعت گوئی'' کے علاوہ ''تعمیری واصلاحی نعت گوئی''ان کا طرّہ ٔامتیاز وسرمایہ افتخار ہے۔

اصطلاحی طور پر جسے ''معیاری اور حقیقی نعت'' کہتے ہیں، اگر وہ نفس الامر میں واقعی حقیقی و معیاری ہو تو اس نعت کے موزوں کرنے والے کو ذاتی زندگی میں اس کے نعتیہ انہماک کو دیکھتے ہوئے ''فنا فی النعت'' کہہ سکتے ہیں۔

## معیاری نعت گوئی:

معیاری نعت گوئی کا مفہوم ہے: '' خالص نعت کے طور کہے گئے وہ مشروع کلام، جن میں فکر وفن مجروح نہ ہوا ہو۔ الوہیت و رسالت نیز عبد و

''عبدہٗ'' کے فرق کے علاوہ معبود و محبوب کی عظمتوں کے پیشِ نظر سچی محبت، دلی جذبات، کمالِ محبت اور حد درجہ عجز و ادب سے کہے گئے پُر تاثیر اور ادبی خوبیوں سے مالا مال کلام''۔

(اردو نعت کا ہیئتی مطالعہ، ص: ۳۲، مطبوعہ: پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

الفت و عقیدت جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو ''عشق'' کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے اور جوں جوں عشق کے دریا میں تلاطم برپا ہوتا ہے اور انسان عشق کی بھٹی میں جل کر راکھ کی ڈھیر میں تبدیل ہونے کے قریب پہنچ جاتا ہے تو یہیں سے اس کی ''منزلِ فنا'' شروع ہونے لگتی ہے۔ علمِ تصوّف و معرفت میں ''فنا فی اللہ''، ''فنا فی الرسول'' اور ''فنا فی الشیخ'' کی اصطلاح عام ہے۔ اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں کہ یہ تینوں مقامات انسان کو اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر ان ذواتِ قدسیہ کے نظّارہ جمال و کمال میں محو بلکہ غرق ہو جائے۔ کچھ یہی حال ''فنا فی النعت'' کا بھی ہے کہ جب شاعر عشقِ رسول کے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنا سب کچھ ''بارگاہِ حبیبِ خدا'' میں نذر کر دیتا ہے اور اپنے نبی سے عشق و عقیدت ہی کو دنیا و آخرت کی سرفرازیوں کا ذریعہ سمجھنے لگتا ہے، اس وقت اس کی وہی حالت و کیفیت ہو جاتی ہے جو ایک دنیاوی عاشق کی ہوا کرتی ہے۔ ایسی کیفیت سے دوچار ہونے کے بعد انسان اپنے آقا کی تعریف و توصیف کو ہی حاصلِ زندگی اور مآلِ بندگی سمجھنے لگتا ہے اور یہی ''فنا فی النعت'' کا پہلا زینہ ہے۔

جناب سید نور صاحب ایک سچے عاشقِ رسول ہیں۔ عشقِ رسالت ان کی رگ رگ میں خون بن کر دوڑتا ہے۔ فنا فی النعت کی حد تک ان کا جذبہ نعت گوئی، دراصل ان کے عشقِ کامل کا عملی اظہار ہے۔ سرکار علیہ السلام سے غایت

درجہ عقیدت و محبت نے ہی انہیں آج اس مقام تک پہنچادیا ہے کہ ''نعت گوئی و نعت خوانی'' کو ہی وہ اپنا کُل سرمایہ حیات سمجھتے ہیں۔ نعت لکھنا، نعت پڑھنا، نعت کے بارے میں سوچنا، نعت کے فروغ واستحکام سے متعلق عملی سرگرمیوں میں حصہ لینا، دوسروں کو نعت گوئی کی ترغیب دینا، نعت گو شعراء کی حوصلہ افزائی کرنا اور خصوصیت کے ساتھ نعتیہ مجموعہ ہائے کلام کی طباعت و اشاعت کی خاطر ''دبستانِ نوابیہ عزیزیہ'' کا قیام عمل میں لانا، یہ ساری چیزیں اس بات کی کھلی دلیل ہیں کہ موصوف واقعی ''فنافی النعت'' ہیں۔

عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم (جو ایمان کی جان اور اسلام کی پہچان ہے) کی دولت اور نعت گوئی کا جذبہ بیکراں انہیں وراثت میں ملا ہے۔ ان کے والد گرامی فخر السالکین، سراج العارفین، عاشقِ سید المرسلین حضرت الحاج الشاہ سرکار صوفی سید نوّاب علی شاہ حسنی جہاں گیری ابوالعلائی علیہ الرحمہ اپنے وقت کے ولیِ کامل، عارف باللہ اور خدارسیدہ بزرگ تھے، جذبہ عشقِ صادق کا یہ حال تھا کہ ہمیشہ اپنے محبوب جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں منہمک رہتے۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اپنے نبی کو یاد کر قلبِ حزیں کو تسکین پہنچاتے۔ ذکرِ الٰہی اور ذکرِ مصطفائی ان کی روحانی غذا تھی۔ اپنے نبی کی نعت گوئی و ثنا خوانی اتنی زیادہ عزیز تھی کہ بارہا فرماتے: ''نعتِ رسولِ پاک سے بڑھ کر دنیا کی کوئی چیز مجھے محبوب و مرغوب نہیں۔ اگر مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو تو سرکار علیہ السلام کی نعتِ پاک سناؤ''۔

اپنے باکمال والد کی آغوشِ شفقت میں تعلیم و تربیت کے مراحل طے کرنے والے یہ ہونہار فرزند ''الولد سر لابیہ'' کے مصداق ٹھہرے اور اپنے والد کے بہت سارے اوصاف و کمالات کے مظہر بنے۔ عبادت و اطاعت، عشق و

عقیدت ، سوز و گداز ، نعت گوئی و نعت خوانی سے والہانہ لگاؤ ، یہ ساری خصوصیات پدرِ بزرگ وار کے فیضِ تربیت کا نتیجہ ہیں۔

## نمونہ کلام :

جناب سید نور الحسن نور صاحب کا یوں تو سارا کلام وفورِ جذبات ، پاکیزگیِ خیالات اور جذبہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم سے سرشار ہے۔ لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ وہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو ''صنفِ نعت '' کے حوالے سے ان کے مچلتے جذبات اور قلبی احساسات کے آئینہ دار ہیں۔ ان اشعار سے بخوبی اندازہ ہوگا کہ نور صاحب واقعی ''فنافی النعت'' ہیں۔

لب پر چراغِ نعت فروزاں کیے ہوئے
صد شکر ہوں نجات کا ساماں کیے ہوئے
دور ہوتے ہیں تو ہو جائیں سخنداں مجھ سے
شاعری نعت کی بس ہو نہ گریزاں مجھ سے
اشعارِ نعتِ سرورِ دیں جب رقم ہوئے
نازاں بہت نصیب پہ لوح و قلم ہوئے
میرا ہر ایک شعر ، مری فہم ، میری فکر
سب اس مدارِ کُن کے لیے انتساب ہے
گلشنِ یادِ نبی سے ذہن ہے مہکا ہوا
اور دل تازہ ہوا ہے نعت کے اشعار سے

ہے شہر یارِ شہرِ سخن نور اس کی ذات
حاصل جسے ہے دولتِ مدحت رسول کی
اے نور مبارک ہو نعتِ شہِ دیں کہنا
اس شغل نے لاکھوں کی تقدیر اجالی ہے
نعتِ رسول لکھئے بصد شوق و انبساط
چھوٹے مگر نہ ہاتھ سے دامانِ احتیاط
مجھ پر عطا ہے خاص یہ ربّ ِ غفور کی
حصے میں آئی ہے مرے مدحت حضور کی

☆☆☆

مجھ سے مت پوچھ کیا ہے نعت شریف
سنتِ کبریا ہے نعت شریف
عرشیوں کی صدا ہے نعت شریف
فرشیوں کی دعا ہے نعت شریف
زندگی رنج و غم کا صحرا ہے
رحمتوں کی گھٹا ہے نعت شریف
کیوں نہ ہو موجب رضائے خدا
وصفِ شاہِ ہدیٰ ہے نعت شریف
نور اپنا یہی عقیدہ ہے
دافعِ ہر بلا ہے نعت شریف

نعت گوئی کے بحرِ بیکراں میں غواصی کے بعد بھی جب تشنگی نہیں بجھتی ہے تو اللہ عز و جل اور اس کے حبیب سید عالم صلی اللہ علیہ سے یوں التجائیں کرتے ہیں:

چہچہاتا رہے ہر وقت مرا طائرِ شوق
یا خدا نعت کا وہ ذوقِ فراواں دے دے
حیاتِ خضر عطا کردے اے خدا مجھ کو
ترے حبیب کی منظور ہے ثنا مجھ کو
حضور طائرِ مضموں کے قافلے بھیجیں
بنائی ذہن میں ہے نعت کی فضا مجھ کو

سید نور صاحب کی فکر انگیز نعتیہ شاعری میں ایک مربوط نظامِ فکر کو سر چشمہ تخلیق کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے ''فنا فی النعت'' ہونے کا فلسفہ اور ان کی شاعری کی بڑائی اس بات میں مضمر ہے کہ اُس میں ایک خاص نظامِ فکر کی توسیع نمایاں ہے اور وہ ہے: ''محسنِ انسانیت، پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و رفعت کا اظہار، ان کے فضائل و کمالات کی ترسیل و تشہیر اور پوری دنیائے انسانیت کا رشتہ حضور علیہ السلام کی ذات سے جوڑ کر اسے گنبدِ خضریٰ کے رنگ میں رنگنے کی سعیِ جمیل''۔

## وفورِ جذبات اور قرینہ اظہار :

شاعری محض الفاظ کی جادوگری یا موزوں جملوں کی نشست و برخاست کا نام نہیں، بلکہ اوزان و بحور، قوافی اور ردیف کی پابندی کے ساتھ معنی کی صداقت، مفہوم کی قطعیت، حسنِ زبان و بیان، زورِ تخیل اور ندرتِ افکار و خیالات وغیرہ کا التزام بھی چاہتی ہے، جس سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کے لیے سخت محنت اور کمالِ ریاضت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اگر

یہی شاعری، نعت گوئی کا روپ دھار لے تو اس کی اہمیت اور صنفی دشواری کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم نے نعت گوئی کو سب سے مشکل، دشوار اور زہرہ گداز صنف قرار دیا ہے اور اس کے مالہ و ماعلیہ پر ناقدانہ حیثیت سے روشنی ڈالی ہے۔ نعت گوئی کے لیے عقیدہ وعقیدت کی گہرائی، جذبوں کی سچائی اور مقامِ الوہیت و رسالت سے شناسائی ضروری ہے۔ یہاں الفاظ کے ساتھ افکار کا باوضو ہونا بھی ضروری ہے، تب کہیں جا کر شاعری، نعت کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔

پروفیسر ابواللیث صدیقی (تلمیذ علامہ سید سلیمان اشرف بہاری) اپنی مایہ ناز تصنیف ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' میں محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری پر کلام کرنے سے قبل بطورِ تمہید لکھتے ہیں:

نعت گوئی کی فضا جتنی وسیع ہے، اتنی ہی اس میں پرواز مشکل ہے۔ پرواز سے پہلے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ فضا سازگار بھی ملے گی یا نہیں؟ اگر ہمتِ پرواز مشکل مقام پر پہنچا دے تو بھی اڑنے والے کا یہ کمال ہونا چاہیے کہ وہ کامیابی کے ساتھ وہاں سے گذر جائے۔

(لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ص:۳۱۲؛ سلسلہ مطبوعات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

سید نور صاحب کی نعتیہ شاعری ان کے پاکیزہ خیالات اور لطیف احساسات کی آئینہ دار ہے، جس میں عشق و سرمستی، خلوص و دیانت اور صداقت کے ساتھ وفورِ جذبات اور قرینہ اظہار کا عنصر خاص طور سے شامل ہے۔ ان کی شاعری نبوت و رسالت سے متعلق ان اٹل سچائیوں کا اعتراف و اظہار ہے، جس میں عشقِ رسول اور اطاعتِ مصطفیٰ کی جہت سے تعمیر حیات کا پہلو سب سے نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے آقا کی مدح وثنا کے

ساتھ جا بجا اہلِ دنیا کو عشقِ رسول اور اطاعتِ مصطفوی کا درس دیتے بھی نظر آتے ہیں۔اسی لیے تو کہتے ہیں:

سلطانیِ عالم بھی کوئی چیز نہیں ہے
اے دولتِ عشقِ شہِ بطحا ترے آ گے
ہو قلب اگر جلوہ گہِ رحمتِ عالم
خود کھنچ کے چلا آئے گا کعبہ ترے آ گے
تو ان کی غلامی کی سند کر لے جو حاصل
رکھ دے گی جبیں دولتِ عقبیٰ ترے آ گے
نبی کا عشق اگر تیرا رہنما ہوتا
تو سہل زیست کا ہر ایک مرحلہ ہوتا
سنّتوں کے نور میں آؤ گزاریں زندگی
راستہ ہے بس یہی خوش بختیِ دارین کا
ہم کیوں تلاشِ ضابطہ زندگی کریں
ہم کو نبی کے عشق کا آئین چاہیے

وفورِ جذبات اور قرینہ اظہار کی چنگاری ، سینے میں دہکتے ہوئے عشق و عقیدت کے آتش کدے سے پھوٹتی ہے اور عاشق کے حال وقال کی دنیا میں آگ لگا دیتی ہے۔اس کے بعد وہی ہوتا ہے کہ جوایک عاشقِ صادق کے ساتھ بالعموم ہوا کرتا ہے کہ عاشق سراپا عجز و نیاز بن کر اپنے محبوب کی بارگاہ میں سجودِ نیاز لٹانے کے لیے بیقرار رہتا ہے۔مناظرِ قدرت اور مشاہدِ فطرت میں اس کو اپنے محبوب کا حسین چہرہ نظر آتا ہے۔اس کے بعد وہ اپنے محبوب کی تعریف وتوصیف کو اپنا حرزِ جاں بنالیتا ہے۔وفورِ جذبات اور قرینہ اظہار کی منزل یہیں سے شروع

ہوتی ہے۔

وفورِ جذبات، عشق وعقیدت کی انتہا ہے۔قرینہ اظہار کے لیے حد درجہ حزم واحتیاط اور مقامِ الوہیت ورسالت کے نازک فرق وامتیاز کا جاننا ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ شاعر نعت گوئی کے شرعی حدود وقیود سے آگاہ ہو۔نعت کے لیے طہارتِ قلب، نفاستِ فکر اور پاکیزگیِ خیال کے ساتھ محبتِ رسول اور جذبہ عشق وارادت ضروری ہے۔اس کے بغیر نعتیہ شاعری وجود میں نہیں آسکتی۔شرعی نقطہ نظر سے نعت گوئی کے لیے مندرجہ ''اصولِ ثلاثہ'' کا پایا جانا ازحد ضروری ہے۔

(۱) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی عظمت ورفعت کا صحیح ادراک و عرفان۔

(۲) عشقِ رسول اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وتسلیم۔

(۳) آدابِ نبوّت اور احترامِ رسالت کا حد درجہ پاس ولحاظ۔

سید نور صاحب کی نعتیہ شاعری میں یہ تینوں اصول وشرائط پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں۔انہیں اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ورفعت کا ادراک وعرفان بھی ہے اور عشقِ مصطفوی کے ساتھ آدابِ نبوت و رسالت کا حد درجہ پاس ولحاظ بھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی نعتیہ شاعری، وفورِ جذبات اور قرینہ اظہار کا بڑا حسین اور کیف آگیں منظر نامہ پیش کرتی ہے۔

وفورِ جذبات اور قرینہ اظہار کا والہانہ انداز ملاحظہ کریں:

قدموں میں مصطفیٰ کے لٹانے کے واسطے
پھرتا ہوں دل کو لعلِ بدخشاں کیئے ہوئے

غازہ بنا لوں چہرہ ایماں کے واسطے
پاؤں جو تھوڑی خاک تری رہ گزار کی
جہانِ عشق میں عشّاقِ باوفا کے لیے
خیالِ سرورِ دیں ، تجھ سے محترم کیا ہے
یہ عشق کا ہے تقاضا ، یہ دل کی ہے آواز
غبارِ شہرِ مدینہ کو دل ربا کہیے
عشقِ رسول جان و جگر میں اتار کے
بیٹھا ہوں کائنات کو ٹھوکر پہ مار کے
ہو جائے گا فراخ نگاہوں کا دائرہ
پلکوں سے دیکھ کوچہ طیبہ بُہار کے
سرکار کا ہے نقشِ کفِ پا مرے آگے
سر رکھے ہے ہر اوجِ تمنّا مرے آگے
جب نزع کا ہو وقت ، کوئی لے کے کھڑا ہو
اے گنبد خضریٰ ترا طغریٰ مرے آ گے
شہرِ نبی کی سمت جو روئے سفر ہوا
افلاک عظمتوں کے مرے ہم قدم ہوئے
خاکِ درِ نبی سے جو میری نظر ملے
افکار کو عروج ملے ، دل کو پَر ملے
اک جرعہ جس کا کرتا ہو روشن چراغِ ہوش
سب جانتے ہیں عشق نبی وہ شراب ہے

آیا جو ان کے ناخنِ پا کا مجھے خیال
آنگن میں چاندنی مہِ نو کی بکھر گئی
اک ذرّہ کیا ملا درِ سرکار کا مجھے
کہنے لگے سب آئینے مہتاب پا مجھے
اے دل جہاں دیارِ رسولِ کریم ہے
ہونا ادھر ہی روئے خیالات چاہیے
نبی کے حسن کو بے داغ آئنہ کہیے
مہ و نجوم کو عکسِ نقوشِ پا کہیے

ان اشعار کو بار بار پڑھیے اور سر دھنتے جایئے۔ وفورِ جذبات اور قرینہ اظہار کا اس سے بہتر نمونہ اور کیا ہوسکتا ہے؟

کمالِ عشق اور غایتِ عقیدت میں ڈوبے ہوئے اس قسم کے سحر آفریں اشعار نور صاحب کے نعتیہ مجموعے میں کثرت سے موجود ہیں۔ صفحات کی قلت مانع ہے، ورنہ قارئین کی ضیافت طبع کے لئے مزید اشعار سپردِ قرطاس کرتا۔

## موضوعات کا تنوّع :

جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات وصفات کی حمد وثنا کما حقہٗ ممکن نہیں، اسی طرح اس کے محبوب، سید المرسلین جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل وکمالات کی شایانِ شان تعریف وتوصیف انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اپنے وقت کا بڑے سے بڑا فصیح وبلیغ اور لسان العصر ادیب وشاعر بھی

یہ دعویٰ ہرگز نہیں کرسکتا کہ اس نے حمد و نعت گوئی کا حق ادا کر دیا۔ ہاں! وہ کسی حد تک حمد و نعت کے موضوعات کا احاطہ کرسکتا ہے۔ اور جہاں فن کے موضوعات میں تنوّع اور وسعت و ہمہ گیری ہو، وہاں یہ احاطہ بھی ممکن نہیں۔ نعت گوئی ایک مستقل اور ہمہ گیر صنفِ سخن ہے، جو صرف نبی آخر الزماں، پیغمبر اعظم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا تک ہی محدود نہیں، بلکہ آپ کی زندگی و بندگی یعنی آپ کی ولادت سے لے کر وفات تک کے تمام امور و معاملات اس میں شامل ہیں۔ مؤرخین کی اصطلاح میں جسے ''سیرتِ طیبہ یا سیرت رسول'' کہتے ہیں، اس کے تمام عناصر و اجزاء صنفِ نعت میں سمٹ آئے ہیں۔ لہٰذا اس کی وسعت و ہمہ گیری سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ حقیقت آمیز تجزیہ ملاحظہ کریں:

نعت کا لفظ، شاعری کی کسی ہیئت کی طرف نہیں بلکہ موضوع کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یعنی شاعری کی مختلف ہیئتوں مثلاً: قصیدہ، مثنوی، غزل رباعی، قطعہ، مخمس، مسدّس وغیرہ میں سے کسی بھی ہیئت میں نعت کہی جاسکتی ہے، لیکن اس کے موضوع سے انحراف یا تجاوز نہیں کیا جاسکتا۔

نعت کا موضوع بظاہر بہت مختصر نظر آتا ہے، اس لیے کہ اس کی حدیں حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی زندگی اور سیرت سے آگے نہیں بڑھتیں۔ لیکن غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نعت کا موضوع حقیقتاً ایک انتہائی عظیم اور وسیع موضوع ہے۔

عظیم اس لیے کہ اس کا تعلق دنیا کی عظیم ترین شخصیت اور محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو کسی خاص قوم یا گروہ کے لیے نہیں بلکہ ساری اقوامِ عالم کے لیے رحمت بن کر آئے تھے اور خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن عظیم میں

جگہ جگہ ان کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ اور جہاں تک موضوعِ نعت کی وسعت کا تعلق ہے تو اس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور سیرت کے توسّط سے انسانی زندگی کے سارے ثقافتی وتہذیبی پہلو اور سماجی و سیاسی مباحث در آئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو اور فارسی کے بیشتر شعراء نے عموماً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کے حلیہ اقدس، واقعہ معراج اور معجزات ہی کو اپنی توجّہ کا مرکز بنایا ہے، لیکن نعت کے موضوع کا دائرہ اس سے بہت وسیع ہے۔ اس میں شمائل و فضائل کے ساتھ ساتھ معمولاتِ نبوی، غزواتِ نبوی، عباداتِ نبوی، آدابِ مجالسِ نبوی، پیغاماتِ نبوی اور اخلاقِ نبوی کے بیشمار پہلو شامل ہیں۔

حسنِ عمل، حسنِ سلوک، حسنِ خیال، حسنِ بیان اور حسنِ معاملہ سے لے کر عدل و انصاف، جود وسخا، ایثار واحسان، سادگی و بے تکلفی، شرم وحیا، شجاعت ودیانت، عزم واستقلال، مساوات وتواضع، مہمان نوازی، ایفائے عہد، زہد وقناعت، عفو وحلم، رحم ومروت، شفقت ومحبت، عیادت وتعزیت، رقیق القلبی و جاں گدازی، رحمت وشفقت، لطفِ طبع ولطفِ سخن اور انسانی ہمدردی وغم خواری تک تمدنی زندگی کا کون سا پہلو اور کون سا رخ ہے ایسا ہے جس کی ترغیب وترویج و تزئین وتطہیر کا سامان نعت کے موضوع کے اندر موجود نہیں۔ حق بات یہ ہے کہ عظمتِ انسانی کے جتنے گیت آج تک گائے گئے ہیں اور ایک عظیم انسان کے بارے میں جتنے تصوّرات آج تک قائم کئے گئے ہیں، وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت للعالمینی کے ایک جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے یہاں نعتیہ شاعری یا ایسی شاعری جس کے موضوع کا تعلق اسلام یا اسلامی اقدار وروایات سے ہو، کچھ زیادہ لائقِ پذیرائی خیال نہیں کیا جاتا۔ اوّل تو ان اقدار کی متحمل نظموں کو مذہب، اخلاقیات اور تاریخ

کا منظوم درس خیال کر کے ہمارے ناقدین ان پر نظر ڈالنا ہی پسند نہیں کرتے اور بے دلی و تنگ نظری کے ساتھ کسی نے اس پر توجہ کی تو ایسی نظموں کو صحافت سے قریب تر "موضوعاتی شاعری" کا نام دے کر انہیں بے وقعت اور کم مایہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(غزل، نعت اور مثنوی؛ ص: ۲۶۸/۳۶۷؛ الوقار پبلیکیشنز، لاہور، پاکستان)

موضوعاتِ نعت کے حوالے سے مندرجہ بالا اقتباس مبنی بر حقیقت ہونے کے ساتھ ایک اہم اصول کی حیثیت رکھتا ہے اور نعت گو شعراء کو دعوتِ فکر و عمل دیتا ہے۔ نعت کو محض تعریف و توصیف اور مدح و ثنا تک محدود نہیں رکھنا چاہیے، بلکہ اسے اس کے وسیع موضوعات کے سانچے میں ڈھالنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے، تاکہ صنفِ نعت محض رسمی چیز اور روایتی ڈگر سے اوپر اٹھ کر ایک مستقل فن کا روپ دھار سکے۔

ناقدینِ ادب نے نعت کی ادبی و صنفی حیثیت متعیّن کرنے میں نہایت بخل، تعصّب اور تنگ نظری سے کام لیا ہے اور مذہب سے جوڑ کر اس مایۂ ناز فن کو ناقابلِ اعتناء گردانا ہے، جو دراصل مذہب بیزاری کا نتیجہ ہے۔ اگر مذہب کی بنیاد پر نعت کی ادبی و صنفی حیثیت متعیّن نہیں کی جاسکتی اور اسے دائرہ ادب سے خارج قرار دیا جاسکتا ہے تو پھر "مرثیہ" کو بھی زمرۂ ادب سے خارج کیا جانا چاہیے اور اسے ایک مستقل صنفِ سخن کی حیثیت سے قبول نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ مرثیہ نگاری کا تعلق بھی مذہب ہی سے ہے اور ایک خاص طبقے کی شناخت ہے۔

نعتیہ شاعری کو اگر خلوص و محبت اور صداقت و واقعیت کے ساتھ خوب صورت پیرایۂ بیان اور دلکش اسلوبِ اظہار مل جائے تو اس میں ادبی و

تخلیقی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ جناب سید نور صاحب کی نعتیہ شاعری میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ خلوص، عقیدت، صداقت، وفورِ جذبات اور خوب اسلوبِ بیان کے نمونوں سے ان کا کوئی کلام خالی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نعتیہ شاعری میں تخلیقی شان پائی جاتی ہے اور محققینِ ادب کو دعوتِ مطالعہ دیتی ہے۔

علاوہ ازیں ان کی نعتیہ شاعری کا ایک منفرد اور امتیازی وصف "موضوعات کا تنوع" ہے، جو اپنے جلو میں بہت کچھ معنوی خصوصیات رکھتی ہے۔

پروفیسر شمائلہ صدف (فیصل آباد، پاکستان) نے جناب سید نور صاحب کی نعتیہ شاعری میں موضوعات کے تنوع کو "صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھایئے" کا نام دیا ہے (جو مبنی بر حقیقت ہے) اور اس حقیقت کی جانب ان الفاظ میں اشارا کیا ہے:

حضرت نور نے نعتیہ شاعری میں روایت وجدت کے خوب صورت امتزاج سے نادر ادب پارے تخلیق کئے ہیں۔ صنفِ نعت میں جداگانہ طرز آپ کی اخلاص نیت، فنی پختگی و مہارت، زبان و بیان پر خلاقانہ گرفت اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم سے آپ کے عشق کی دلیل ہے۔ آپ کی نعتیہ شاعری نو بہ نو موضوعات، مقصدیت، گہرائی و گیرائی اور عشق کی والہانہ کیفیتوں کی بنا پر خاص اہمیت کی حامل ہے۔ جدید اسالیب و تراکیب کی ایجاد اور ان سے نت نئے معانی کی تخریج آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نعتیہ کلام دراصل محبوب خالق ومخلوق کے نام محبت و عقیدت بھرے مکاتیب ہیں اور ان مکاتیب کی رسائی کا وسیلہ صرف اور صرف آپ کا وہ عشق ہے، جو جذبوں کی سرشاری، نادرہ کاری اور متانت

اظہار کے ساتھ شرف یابی پاتا ہے۔

(ثنا کی نکہتیں ۔مجموعہ نعت برزمینِ غالب، ص:۲۸-۲۹)

جناب سید نور صاحب کے دماغ میں شاعرانہ تخیّل اور طبیعت میں جدّت وانفرادیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے سمندِ خیالات کو روایت کے بجائے درایت کی شاہراہوں پہ بھگاتے رہتے ہیں اور کچھ نیا ڈھونڈ نکالنے کی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں۔انھوں نے اپنی بامقصد نعتیہ شاعری کو صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اسے ''سیرت نگاری'' کے حسین پیکر میں ڈھالنے کی سعیِ مشکور فرمائی اور یہ سوچ کر کہ کہیں ان کی نعت گوئی ''حقیقی ومعیاری نعت گوئی'' کی ڈگر سے ہٹ کر ''سوانحی نعت گوئی'' کے زمرے میں داخل نہ ہو جائے، بالکلیہ ''سیرت نگاری'' سے اجتناب برتا،لیکن موضوعات کے تنوّع سے اپنی نعتیہ شاعری کے دامن کو بھر دیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں موضوعات کا تنوع مثلاً: عادات وخصائل،حسنِ صورت،فضائل وکمالات،عبادات، معاملات،غزوات،معجزات، ذکرِ اولاد واصحاب، واقعۂ معراج،میلادِ مصطفیٰ وغیرہ اور سرکار علیہ السلام کی زندگی وبندگی سے متعلق بیشمار پہلو اور انگنت پرتیں یکے بعد دیگرے کھلتی نظر آتی ہیں اور قارئینِ کو دعوتِ فکر وعمل دیتی ہیں۔''مشتے نمونہ ازخروارے'' کے طور پر چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

سامنے رکھ لے چراغِ صبح و شامِ مصطفیٰ
چہرۂ کردار تیرا ضوفشاں ہو جائے گا

اسرار ہست و بود کے ہم پر کھُلا کئے
ہم ''سیرتِ رسولِ مکرّم'' پڑھا کئے

میلادِ مصطفیٰ میں چراغاں کے واسطے
لانا پڑے تو لاؤ ستارے اتار کے

رکھا ہے قدم جب مرے سرکار نے اے نور
سرسبز ہوا ہے چمنستانِ جہاں اور

رکی ہیں وقت کی سانسیں، تھمی ہے نبضِ جہاں
چلے ہیں شاہِ اُمم سیرِ لا مکاں کے لیے

ادنیٰ سا یہ اعجاز ہے آقا کی نظر کا
سورج نے بھی جو روئے سفر موڑ دیا ہے

بکھیرتا ہے بہاریں ہرا بھرا ہو کر
مرے حضور جو سوکھے شجر کو دیکھتے ہیں

کردارِ گہر بار کی تلوار چلا کر
سرکار نے دشمن کا بھی دل جیت لیا ہے

اہلِ خطا کو بھی ملا پروانہ نجات
محشر میں جلوہ گر جو شفیعِ اُمم ہوئے

یاد بوبکر سا جو آیا رفیق
نور ہجرت کا سفر یاد آیا

☆☆☆

## شعری وادبی خدمات :

زبان اور شعر و ادب کی خدمت ایک طرح سے ''خدمتِ خلق'' کا درجہ رکھتی ہے اور عبادت میں شمار کی جاتی ہے۔ اگر یہ ادب نہ ہوتا کہ آج

ہمارے پاس مختلف علوم و فنون اور دینیات و اسلامیات کا عظیم سرمایہ اور قابلِ قدر ذخیرہ نہ ہوتا۔ راقم کے ناقص خیال میں ''ادب برائے زندگی'' سے زیادہ ''ادب برائے بندگی'' اہم اور وقیع ہے۔ سید نور الحسن نور کی تمام تر شعری، ادبی اور لسانی سرگرمیاں ''ادب برائے بندگی'' کے لیے ہیں، جن سے دین و مذہب اور مسلک و مشرب کے فروغ کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت بھی وابستہ ہیں۔

ان کا ادبی شعور و وجدان اور شعری زبان ان کی عمر اور تجربے سے زیادہ قوی، فکر انگیز اور شیریں ہے۔ موصوف عمدہ فکر، اعلیٰ تخیّل اور گہری بصیرت کے حامل ادیب و شاعر ہیں۔ ان کی نعتیہ شاعری میں الفاظ و معانی کی لطافت، زبان کی فصاحت، بیان کی بلاغت، فکر و فن کی پاکیزگی، شعور کی پختگی، پیرایۂ بیان کی عمدگی اور اثر آفرینی کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کے امتیازی پہلوؤں میں سے موضوعات کا تنّوع، اسالیب کا نیا پن، لفظیات کی مقناطیسی کشش اور معنیات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جا بجا نظر آتا ہے۔ ان کے فکر و فن پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے، جس کی کچھ جھلکیاں زیرِ نظر کتاب ( کلام نور کے ادبی محاسن ) میں پیش کی گئی ہیں۔ بلا مبالغہ سید نور الحسن نور خانقاہ نوابیہ عزیزیہ، قاضی پور شریف کی علمی و ادبی روایت کے امین اور دبستانِ نعت کی سیر کرنے والے قافلہ ہائے شوق کے وہ میرِ کارواں ہیں جو اشاعت علم و ادب اور صنفِ نعت کی پرخار وادیوں میں آبلہ پائی کا شکوہ کیے بغیر مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں اور نو آموز نعت گو شعرا کو دعوت فکر و عمل دے کر نعتیہ ادب کے فروغ کے راستے ہموار کر رہے ہیں۔ ان کی شعری و ادبی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ جو شہرت و

مقبولیت اور فنی پختگی انسان کو ساٹھ، ستّر سال کی عمر میں حاصل ہوا کرتی ہے، نور صاحب کو وہ ۳۵ر سال کی عمر میں حاصل ہو چکی ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ان کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف خدا کی عبادت، اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف اور زبان وادب کی خدمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت قلیل عرصے میں انہوں نے شعر و ادب اور خصوصیت کے ساتھ نعتیہ ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی شعری وادبی خدمات کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل مجموعہ ہائے کلام اور ادب کی ترویج واشاعت کی خاطر ان کے قیام کردہ اشاعتی ادارہ ''دبستانِ نوّابیہ عزیزیہ'' کی دو درجن مطبوعات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

آپ کے قلمِ اعجاز رقم سے اب تک درج ذیل نعتیہ مجموعہ ہائے کلام زیورِ طباعت سے مزیّن ہو چکے ہیں اور عوام وخواص سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں اور کچھ مجموعے منظرِ عام پر آنے کے پر تول رہے ہیں۔

(۱) وسلموا التسلیما (مجموعۂ سلام)
(۲) قلزمِ نور (مجموعۂ نعت ومناقب)
(۳) مطلعِ نور (حمد ونعت اور منقبت کا مجموعہ)
(۴) ثنا کی نکہتیں (نعوت برزمین غالب)
(۵) جوئے ثنا (مجموعہ نعت ومناقب)
(۶) مرکزِ نور (نعتیہ مجموعہ)
(۷) نعتوں کے دیے (مجموعہ نعت برزمینِ میر تقی میر)

(۸) سبیلِ مؤدّت (مجموعہ مناقب)

(۹) دریچہ نور (نعتیہ مجموعہ)

(۱۰) سورج نکلا ہے (ہائیکو کا مجموعہ)

(۱۱) ایّاکَ نعبد و ایّاکَ نستعین (مجموعہ حمد و مناجات)

**پاکستان سے طبع ہونے والے مجموعے :**

(۱) آبشار نور (نعتیہ مجموعہ)

(۲) ثنا کی نکہتیں (مجموعہ نعت برزمینِ غالب)

(۳) گلاب اسمِ نبی کی خوشبو (مجموعۂ نعت)

(۴) ایّاکَ نعبد وایّاکَ نستعین (مجموعہ حمد و مناجات)

(۵) سورج نکلا ہے (ہائیکو کا مجموعہ)

**زیرِ طبع مجموعے:**

(۱) شجرِ نور (مجموعۂ نعت و مناقب)

(۲) شاخِ نوا (مجموعہ غزلیات)

(۳) رباعیاتِ نور

## دبستانِ نوّابیہ عزیزیہ کی مطبوعات :

دبستانِ نوّابیہ عزیزیہ، قاضی پور شریف، ضلع فتح پور (ہسوہ) ایک عظیم اشاعتی ادارہ ہے، جس کا قیام آج سے تین سال پیشتر جناب سید نور صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا ہے۔ یہ مکتبہ ان کی ادبی خدمات کا ایک واضح ثبوت ہے، جہاں سے صرف تین سال کی مدت میں اب تک چھبّیس کتابیں (مختلف شعرائے عظام کے کلیاتِ نعت و مناقب) شائع ہو چکی ہیں۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| (۱) | مطلعِ نور | (۲) | ثنا کی نکہتیں (مجموعہ نعت بر زمین غالب) |
| (۳) | جوئے ثنا | (۴) | مرکزِ نور |
| (۵) | موجِ کرم | (۶) | بامِ ایجاب |
| (۷) | مناقب الاخیار | (۸) | دریچہ نور |
| (۹) | سورج نکلا ہے | (۱۰) | سخن در سخن |
| (۱۱) | سبیلِ مودّت | (۱۲) | ایاک نعبد وایاک نستعین |
| (۱۳) | نعتوں کے دیے | (۱۴) | پسِ اعترافِ سخن |
| (۱۵) | ذوقِ مدحت | (۱۶) | حرفِ مدحت |
| (۱۷) | حریمِ نعت | (۱۸) | حدیقہ رنگ |
| (۱۹) | رحمت تمام | | |

امتدادِ زمانہ اور مرورِ ایام کے ساتھ موصوف کے فکر وفن میں نمایاں ترقی دیکھنے کو مل رہی ہے اور وہ آئے دن شعر وسخن کے ہفت اقلیم طے کرتے نظر آ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جملہ اہلِ بیت اطہار کے صدقے گلشنِ نواب علی شاہ کے اس گلِ سر سبد کو ہمیشہ سر سبز وشاداب رکھے اور ان کے علم وعمل اور عمر و اقبال میں بے پناہ ترقیاں عطا فرمائے آمین۔

☆☆☆

## شاعری کی مختصر تاریخ :

شاعری کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے، جتنی خود حضرتِ انسان کی۔ دنیا کے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے پہلے آپ ہی نے اپنے بیٹے ہابیل کے قتل پر غم واندوہ میں ڈوب کر سریانی زبان میں شعر کہا ہے۔ جیسا کہ حضرت امیر خسرو اور مرزا صائب نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ما ہمہ در اصل شاعر زادہ ایم !!!
دل بہ ایں محنت نہ از خود دادہ ایم

(امیر خسرو)

آں کہ اول شعر گفت آدم صفی اللہ بود
طبع موزوں حجت فرزندی آدم بود

(مرزا صائب)

قاسم بن سلام بغدادی کی صراحت کے مطابق سب سے پہلے عربی شاعر یصرب بن قحطان تھے، جو حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ فارسی زبان میں سب سے پہلے شعر بہرام گور نے کہا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ سب سے پہلے ابوحفص حکیم سغدی سمرقندی نے فارسی میں شعر کہا۔

شاعری یا بلفظ دگر شعر گوئی کے جواز وعدم جواز میں اہل علم کا اختلاف ہے، لیکن حق اور راجح یہی ہے کہ شاعری جائز ہے، جس کی سب سے مضبوط اور مستحکم دلیل متعدد صحابہ کرام اور اولیائے عظام رضی اللہ عنہم کا قادر الکلام شاعر ہونا اور اس فن سے شغف رکھنا ہے۔ باقی قرآن وحدیث میں جہاں

کہیں شعر گوئی یا شعراء کی مذمت بیان کی گئی ہے، اس کا پس منظر کچھ اور ہے یا پھر اس سے وہ شاعری مراد ہے جو جھوٹ، مبالغہ آرائی، تملق، چاپلوسی، بیجا تعریف اور یاوہ گوئی پر مشتمل ہو، جیسا کہ اہلِ علم ونظر کو معلوم ہے۔

مشہور حدیث پاک ہے" وان من الشعر لحکمہ" یعنی بعض اشعار حکمت سے لبریز ہوتے ہیں۔ تذکرہ مرات الخیال کے مصنف نے جار اللہ زمخشری کے حوالے سے لکھا ہے کہ" وکان الشعر احب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کثیر الکلام"

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہت سارے کلاموں کے مقابل اشعار زیادہ پسند فرماتے تھے۔ اسی طرح تذکرہ مرات الخیال میں ایک روایت اس طرح کی بھی مذکور ہے:

عرش کے نیچے اللہ عز وجل کا ایک خاص خزانہ ہے، جس کی کنجی شعراء حضرات کی زبان ہیں۔ (مؤیدالشعراء معروف بہ عقدالجواھر، ص:۲۶، منشی نوَل کشور، لکھنوٗ)

شاعری سے متعلق چند عظیم شخصیات کے اقوال وآراء ملاحظہ کریں:

اپنے بچوں کو اچھے اشعار سکھاؤ کہ ان سے شجاعت و بہادری کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ)

اچھا کلام، شعر وادب کا بہتریں مرتبہ ہے۔ (حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ)

شعر ایک لطیف چیز ہے، لیکن اسے خوشامد کا آلہ کار بنایا جائے تو بے لطف ہو جاتا ہے۔ (حضرت نظام الدین اولیاء)

لفظی تصویر کا نام شاعری ہے۔ (میکالے)

شعر بہترین الفاظ کا بہترین استعمال ہے۔ (ملٹن)

شاعر کے کے ذاتی تاثرات کا وجدان ، شاعری ہے اور تخیل کا بہترین نغمہ، شعر ہے۔(ہربرٹ اسپنسر)

لفظوں میں خوب صورتی کے مترنم اظہار کا نام شاعری ہے۔(ایڈگرامین پو)

## شاعری کی اہمیت و معنویت :

شعر وسخن کی اہمیت وافادیت کے حوالے سے ایک یورپین مفکر لکھتا ہے:

مشاغلِ دنیوی میں انہماک کے سبب جو قوّتیں سو جاتی ہیں، شعر ان کو جگاتا ہے اور ہمارے بچپن کے ان خالص اور پاک جذبوں کو جو لوحِ غرض کے داغ سے منزّہ اور مبرّہ تھے، پھر ترو تازہ کرتا ہے۔ دنیوی کاموں کی مشق و ممارست سے بیشک ذہن میں تیزی آجاتی ہے مگر دل بالکل مرجاتا ہے۔ جب کہ افلاس میں قوتِ لایموت کے لئے یا تونگری میں جاہ و منصب کے لئے کوشش کی جاتی ہے اور دنیا میں چاروں طرف خود غرضی دیکھی جاتی ہے، اس وقت انسان کو سخت مشکلیں پیش آتیں، اگر اس کے پاس کوئی ایسا علاج نہ ہوتا جو دل کے بہلانے اور ترو تازہ کرنے میں چپکے ہی چپکے مگر نہایت قوت کے ساتھ، افلاس کی صورت میں مرہم، اور تونگری کی صورت میں تریاق کا کام دے سکے۔ یہ خاصیت خدا نے شعر میں ودیعت کی ہے۔ وہ ہم کو محسوسات کے دائرے سے نکل کر گذشتہ اور آئندہ حالتوں کو ہماری موجودہ حالت پر غالب کر دیتا ہے۔ شعر کا اثر محض عقل کے ذریعے سے نہیں بلکہ

زیادہ تر ذہن اور ادراک کے ذریعے اخلاق پر ہوتا ہے۔ پس ہر قوم اپنے ذہن کی جودت اور ادراک کی بلندی کے موافق شعر سے اخلاقِ فاضلہ اکتساب کر سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ تمام دنیا شعراء کا ادب اور تعظیم کرتی ہے۔ جنہوں نے اس خاتمِ سلیمانی کی بدولت جو قوّتِ متخیّلہ نے ان کے قبضے میں دی ہے، انسان میں ایسی تحریک اور برانگیختگی پیدا کی ہے جو کہ خود نیکی ہے یا نیکی کی طرف لے جانے والی ہے۔

(مقدّمہ شعر و شاعری، ص: ۲۸-۲۹؛ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی)

شعر و نقد کی دنیا میں اقبال احمد سہیل (تلمیذ شبلی نعمانی) کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ جناب اصغر گونڈوی کے مجموعہ غزلیات ''نشاطِ روح'' پر ان کا تحریر کردہ فاضلانہ مقدمہ آج بھی شائقانِ ادب کے لئے گنجینہ معنی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ شاعری کی قرار واقعی عظمت و حیثیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

فنونِ لطیفہ کی تقسیمِ چہار گانہ میں شاعری مسلّم طور پر سب سے بلند تر ہے۔ اس کی وجہ محض اس قدر ہے کہ شاعری بقیہ اصناف سخن کی جامعِ محاسن ہے۔ اس کے علاوہ شاعری کے قلمرو میں حقائق و معارف اور اسرار و حِکم کی غیر فانی دنیا بھی شامل ہے، جہاں مصوّری و موسیقی کو کوئی دسترس نہیں۔ مصور کا قلم صرف انہیں کیفیاتِ نفسی کی تصویر کھینچ سکتا ہے جس کا اظہار عوارضِ جسمانی سے ممکن ہے۔ لیکن شاعر کی نگاہ نفسِ انسانی کی ان گہرائیوں تک پہنچتی ہے جہاں کیف و کم کی گنجائش نہیں ہے۔ ایک بت تراش کی تخئیل معادِ ثلاثہ کے حدود سے متجاوز نہیں ہوسکتی، مگر ایک شاعر کا تخیّل عالم قدس تک پرواز کرتا ہے اور ایک نشہ بے کیف اور معنئ بے صورت کو پیکرِ خیالی دے کر

آپ کے پیشِ نظر کر سکتا ہے۔ ایک مغنّی اپنے ترانۂ جاں نواز سے صرف روح میں انبساط پیدا کر سکتا ہے، مگر ایک شاعر اپنے فکر و ترنم سے نفسِ ناطقہ پر بھی عالم وجد و حال طاری کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اگر اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے تو شاعری کے عناصر حسبِ ذیل ہوں گے:

(۱) بت تراشی یا ایجاد و تخلیق (۲) موسیقی (۳) مصوری (۴) اسرار و معارف

اگر شاعری ان ارکانِ اربعہ کی جامع ہے تو یہ بلا شبہ شاعری کی معراج ہے۔

(نشاطِ روح، ص: ۳۸-۳۹، مطبوعہ: عارف پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

## شاعری کی حقیقت و ماہیت :

شاعری کیا ہے؟ دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بیکار ہے تو شاعری بیکار ہے

شاعری، جذبات کی عکّاس و ترجمان ہوا کرتی ہے۔ جذبات کی ترجمانی اور احساسات کے اظہار کے لئے الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے اور جذبات کی نوعیت معانی کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ الفاظ و معانی کے باہمی امتزاج سے ادب وجود میں آتا ہے اور چوں کہ شاعری، ادب کی ایک مقبول و مشہور قسم ہے۔ لہٰذا الفاظ و معانی کو مروجہ اوزان و بحور اور ردیف و قافیہ کے التزام کے ساتھ دل نشیں اسلوب اور عمدہ پیرائے میں بیان کر دینے کا نام ''شاعری'' ہے۔

اربابِ شعر و ادب نے مختلف انداز سے شعر کی حقیقت و ماہیت بیان کی ہے اور الگ الگ طریقے سے اس کی توضیح وتشریح کی ہے۔ شعر کی حقیقت و ماہیت اور فن شاعری کی اولین کلاسیکی کتاب یونان کے مشہور حکیم ارسطو کی ہے، جس کا نام ''بوطیقا'' ہے۔ ارسطو کے بیان کے مطابق ''شعر ایک قسم کی مصوّری ہے''۔

بحر الفصاحت میں ''شعر'' کی تعریف ان الفاظ میں مذکور ہے:

لغت میں شعر کے معنیٰ جاننے کے ہیں اور عروضیوں کی اصطلاح میں ''شعر اس کلامِ موزوں کا نام ہے جو اوزانِ مقررہ میں سے کسی وزن پر ہو اور مقفّیٰ ہو اور بالقصد موزوں کیا گیا ہو''۔ پس یہاں سے معلوم ہوا کہ اگر ایک کلمہ کسی رکن کے وزن پر ہو یا کلام ہو مگر موزوں نہ ہو یا کلام موزوں ہو مگر مقفّیٰ نہ ہو یا کلامِ موزوں مقفّیٰ بالقصد موزوں نہ کیا گیا ہو، وہ اصطلاح کے موافق شعر نہیں ہے۔

(بحر الفصاحت، ص: ۵۰-۵۱، ناشر: راجہ رام کمار بک ڈپو، لکھنؤ)

شاعری کی اثر آفرینی مسلّم ہے، اس لئے بعض اہلِ علم نے شعر کی تعریف میں اثر و تاثیر کی قید لگائی ہے۔ چنانچہ عظیم محقق و ناقد سید مسعود حسن رضوی ادیب شاعری کی حقیقت و ماہیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

علم عروض کی اصطلاح میں کلامِ موزوں کو شعر کہتے ہیں اور منطق کی اصطلاح میں شعر اس کلام کا نام ہے جو انبساط (خوشی) یا انقباض (رنج) کا باعث ہو۔ یا یوں کہیے کہ وہ کلام جس میں اثر ہو یعنی جس کی غرض اپنے دل کی کوئی کیفیت مثلاً: رنج، خوشی، حیرت، جوش، جذبہ، غصہ اور خوف وغیرہ دکھانا ہو یا دوسروں کے دلوں پر کسی طرح کا اثر ڈالنا اور ان کے جذبات کو

ابھارنا ہو۔ ان تعریفوں سے ظاہر ہے کہ اگر کوئی کلام موزوں ہو مگر بے اثر ہو تو وہ عروض کے اعتبار سے شعر ہوگا، مگر منطق اسے شعر نہ کہے گی۔ اسی طرح اگر کسی کلام میں اثر ہو، مگر وہ موزوں نہ ہو تو منطق کی رو سے وہ شعر ہوگا، لیکن عروض اسے شعر نہ سمجھے گا۔ اس لئے کامل شعر اسے سمجھنا چاہیے جو عروضیوں کے نزدیک بھی شعر ہو اور منطقیوں کے نزدیک بھی، یعنی جس پر عروضی اور منطقی دونوں تعریفیں صادق آئیں۔

(ہماری شاعری، ص:۲۶؛ مطبوعہ: نظامی پریس، لکھنؤ)

## شعری محاسن کی نشان دہی :

"کلامِ نور کے ادبی محاسن" کا جائزہ لینے سے قبل شعری محاسن کی نشان دہی ضروری ہے، تاکہ موضوعِ کتاب سے متعلق کماحقہ گفتگو ہو سکے۔ شاعری ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ شعر میں احساسِ جمال، اثر آفرینی، شعور و آگہی اور ظہور و نغمگی کا مفہوم شامل ہے۔ ردیف، قافیہ اور وزن، شعر کے لوازم یا اجزائے ترکیبی نہیں بلکہ شرائط میں سے ہیں۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے بقول:

حقیقت کے اعتبار سے شعر کے دو اجزاء ہیں: -(۱) تخّیل (۲) محاکات؛ دو لوازم ہیں (۱) ذخیرۂ الفاظ (۲) مطالعۂ فطرت؛ دو شرائط ہیں (۱) وزن (۲) قافیہ

تخّیل: یہ وہ قوّت ہے جس کی بدولت شاعر نئی دنیائیں اور نئے نکتے پیدا کر سکتا ہے۔ نقّادانِ فن کی رائے میں شاعری درحقیقت تخّیل ہی کا

دوسرا نام ہے۔ یہ قوت بے جان چیزوں میں جان پیدا کر دیتی ہے۔ صبح و شام، گلستان وصحراء، بہار وخزاں، بلبل و پروانہ اور ساحل و دریا سب چیزیں شاعر سے باتیں کرتی ہیں۔

**محاکات** : محاکات کی تعریف یہ ہے کہ کسی واقعہ یا حالت کو بذریعہ الفاظ اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔ یعنی محاکات دراصل مصوّری کا نام ہے۔

ان امورِ ستّہ (تخیل، محاکات، ذخیرۂ الفاظ، مطالعۂ فطرت، وزن، قافیہ) کے علاوہ آٹھ باتیں اور بھی ہیں جس کی بدولت شعر کی دلکشی اور دل آویزی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۱) بلاغت (۲) سلاست (۳) اصلیت (۴) حسنِ بیان یا طرفگیِ ادا (۵) جوش (۶) تشبیہ (۷) استعارہ (۸) سوز و گداز

(شرحِ دیوان غالب، ص: ۳۷، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور)

آخر الذکر آٹھوں باتیں ''محاسنِ سخن'' کے ذیل میں آتی ہیں۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنی مایہ ناز تصنیف ''نکاتِ سخن'' میں تیسرے باب کو ''محاسنِ سخن'' کے بیان کے لئے مختص کیا ہے اور محاسنِ سخن کے ضمن میں مندرجہ ذیل بیس (۲۰) محاسن وخصوصیات کا ذکر کیا ہے۔

(۱) تکرارِ الفاظ (۲) صدقِ محاورہ (۳) صفائیِ بیان (۴) سادگیِ زبان (۵) ترجمہ محاورہ فارسی (۶) شوخیِ کلام وندرتِ مضمون (۷) خوبیِ ترکیب (۸) حسنِ استعارہ (۹) لطفِ تشبیہ (۱۰) حسنِ استعمالِ الفاظ (۱۱) واقعہ گذاری و جذبہ نگاری و معاملہ بندی (۱۲) نقلِ قول کی تازگی (۱۳) متانت وسنجیدگی، بلندیِ جذبات ومسائلِ تصوف (۱۴) مطابقتِ

الفاظ و مضمون (۱۵) کنایہ (۱۶) سوز و گداز (۱۷) الفاظ کا الٹ پھیر اور مصرعوں کا تقابل (۱۸) استعمالِ جملہ انشائیہ بجائے جملہ خبریہ (۱۹) تعدّدِ الفاظ و فقراتِ موزوں (۲۰) سہلِ ممتنع

(نکاتِ سخن، ص:۸؛ مطبوعہ: انتظامی پریس، حیدرآباد)

خواجہ الطاف حسین حالی نے ''مقدّمہ شعر و شاعری'' میں شاعری کی تین شرطیں بیان کی ہیں اور ہر ایک کی فاضلانہ توضیح پیش کی ہے:

(۱) تخیّل (۲) مطالعہ کائنات (۳) تفحص الفاظ

حالی کی رائے میں یہ وہ امورِ ثلاثہ ہیں، جن کے بغیر شاعری درجہ کمال تک نہیں پہنچتی۔ ان کے علاوہ سادگی، اصلیت اور جوش سے بھرا ہونا، یہ وہ شعری خصوصیات ہیں جو دنیا کے تمام مقبول اور کامیاب شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ حالی، ملٹن کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو''۔

سادگی سے صرف لفظوں کی سادگی ہی مراد نہیں ہے بلکہ خیالات بھی ایسے نازک اور دقیق نہ ہونے چاہئے جن کو سمجھنے کی عام ذہنوں میں گنجائش نہ ہو۔ محسوسات کے شارعِ عام پر چلنا، بے تکلفی کے سیدھے رستے اِدھر اُدھر نہ ہونا اور فکر کو جولانیوں سے باز رکھنا، اسی کا نام ''سادگی'' ہے۔ ''شعر اصلیت پر مبنی ہو'' اس کا مطلب یہ ہے کہ خیال کی بنیاد ایسی چیز پر ہونی چاہیے جو درحقیقت کچھ وجود رکھتی ہو، نہ یہ کہ سارا وجود خواب کا ایک تماشہ ہو کہ ابھی تو سب کچھ تھا اور آنکھ کھلی تو دیکھا کہ سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ بات جیسے مضمون میں ہونا ضروری ہے، ایسے ہی الفاظ میں بھی ہونی چاہیے۔ مثلاً:

ایسی تشبیہات استعمال نہ کی جائیں جن کا وجود عالمِ بالا پر ہو۔

تیسری بات یہ کہ ''شعر جوش سے بھرا ہوا ہو'' اس سے صرف یہی مراد نہیں کہ شاعر نے جوش کی حالت میں شعر کہا ہو، یا شعر کے بیان سے اس کا جوش ظاہر ہوتا ہو، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو لوگ مخاطب ہیں، ان کے دل میں جوش پیدا کرنے والا ہو۔ اور اس غرض کے لیے ضروری کہ ان کے دل ٹٹولے جائیں اور ان کے دلوں کو جذب کرنے کے لیے ایک مقناطیسی کشش بیان میں رکھی جائے۔

(مقدّمہ شعر و شاعری، ص:۶۸-۷۰؛ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی)

## شعر کی لفظی خوبیاں :

کسی بھی عظیم شاعر کے کلام میں ادبی محاسن دریافت کرنے سے پہلے ضروری ہوتا ہے کہ کلام کی لفظی و معنوی خوبیوں پر ایک ہلکی سی روشنی ڈالی جائے کہ آیا وہ کون کون سے امور ہیں جو اشعار کی لفظی اور معنوی خوبیوں کے ضمن میں آتے ہیں؟ ان کی تعریف کیا ہے؟ انہیں کلام میں برتنے کے طریقہ کار کیا ہیں؟ لہٰذا موضوع کی مناسبت سے ہم یہاں سب سے پہلے ان امور کی نشان دہی کرتے ہیں۔ بعد ازاں دلائل و شواہد کی روشنی میں ان کی تعریفات و امثلہ پیش کرتے ہوئے ''کلامِ نور کے ادبی محاسن'' کا جائزہ نذرِ قارئین کرتے ہیں۔

**شعر کی لفظی خوبیاں چار ہیں:**

(۱) سادگی (۲) اختصارِ الفاظ (۳) زورِ کلام (۴) مناسبتِ الفاظ۔

## سادگی یا سلاست :

یہ نظریہ عام ہے کہ سادگی میں جو حسن ودلکشی ہے، وہ تصنّع اور بناوٹ میں نہیں۔ نیچرل اشیاء اور فطری باتوں کو سبھی پسند کرتے ہیں۔ معاشرے میں سادہ طرزِ زندگی گذارنے والے افراد کی ہر کوئی تعریف کرتا ہے اور اسے عزت واحترام کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ کچھ یہی حال شعروادب کا بھی ہے کہ یہاں بھی ''سادگی'' کو حسن سمجھا جاتا ہے اور جس تحریر وتقریر میں سادگی کا عنصر شامل ہو، اسے سامع وقاری پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

شاعری میں ''سادگی'' کا مفہوم یہ ہے کہ شاعر اپنے مافی الضمیر کا اظہار اس طرح کرے کہ مخاطب کو مطلب سمجھنے میں کوئی دقت اور دشواری پیش نہ آئے۔

سادگی کا انحصار کئی چیزوں پر ہے۔ مثلاً:

(الف) تحریر وتقریر میں مشکل اور غیر مانوس الفاظ استعمال نہ کئے جائیں۔ ادب تخلیق کرتے وقت انہیں الفاظ وکلمات کا کا انتخاب کیا جائے جن سے زبان مانوس اور کان آشنا ہوں۔ کلام کی اسی خوبی کا نام ''سلاست'' ہے۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب کے بقول ''جس کلام میں سادگی کی صفت ہوتی ہے، وہ سننے میں جتنا آسان معلوم ہوتا ہے، کہنے میں اتنا ہی مشکل ہوتا ہے''۔ اس لئے جس کلام میں یہ صفت کمال کی حد تک پائی جائے، اسے ''سہلِ ممتنع'' کہتے ہیں۔

(ہماری شاعری، ص:۱۱؛ مطبوعہ: نظامی پریس، لکھنؤ)

سادگی کی مثال :

پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

(مرزا غالب)

(ب) لفظوں کی ترتیب زبان و بیان کے اصول وقواعد کے مطابق ہو۔یعنی اگر شعر کی نثر کرنا چاہیں تو لفظ اپنی جگہ سے نہ ہٹے یا پھر معمولی رد و بدل کے بعد شعر کے الفاظ بالکل نثر جیسے معلوم ہوں۔اکبرالٰہ آبادی کا یہ شعر اس کی عمدہ مثال ہے:

بت کدے میں شور ہے اکبر مسلماں ہو گیا
بیوفاؤں سے کوئی کہہ دے کہ ہاں ہاں ہوگیا

(ج) مضمون کا کوئی ضروری جزو چھوٹنے نہ پائے ، جس سے سادگی کا معیار مجروح ہو۔

(د) اشعار میں ایسی تشبیہیں اور ایسے استعارے نہ لائیں جائیں جن تک ذہن وفکر کی رسائی مشکل ہو۔کیوں کہ تشبیہ یا استعارے کا مقصد تصویر کشی اور مفہوم کو واضح کرنا ہے، نہ کہ اس پر ابہام اور پوشیدگی کا غلاف چڑھانا۔

(ہ) شعر میں کسی غیر مشہور بات کی طرف اشارہ نہ کیا جائے کہ اوّلِ نظر میں اس کی طرف عوام تو کیا خواص کا بھی ذہن منتقل نہ ہو سکے۔ چچا غالب کہتے ہیں:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن کا ہر پیکرِ تصویر کا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز !!!
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

ان دونوں اشعار کا تجزیہ کرتے ہوئے سید مسعود حسن لکھتے ہیں :
بیسویں صدی کے ہندوستانی ''کاغذی پیرہن'' اور ''الف صیقل'' کیا جانیں ؟ ایسی غیر مشہور چیزوں کے ذکر سے یہ شعر عام نگاہوں سے سادگی کے درجے سے گر گئے۔ (ایضاً،ص:۴۸)

## ایجاز واختصار :

یعنی کم سے کم لفظوں میں مطلب ادا کیا جائے اور ضرورت سے زیادہ بات کو طول نہ دیا جائے۔ ہاں ! اگر طول مناسبِ مقام ہو، طول فضول نہ ہو تو وہ اختصار کے منافی نہیں۔ گویا اختصار کا مطلب یہ ہے کہ کوئی لفظ اور فقرہ بے ضرورت استعمال نہ کیا جائے۔

## زورِ کلام :

زورِ کلام سے یہ مراد نہیں کہ بہت دقیق لغات، بھاری بھر کم الفاظ و تراکیب اور شاندار الفاظ استعمال کیے جائیں، بلکہ اس طرح مطلب ادا کیا جائے کہ شاعر اپنے کلام سے جو کیفیت دکھانا چاہتا ہے، وہ پورے طور پر آنکھوں میں پھر جائے۔ جو تصویر وہ کھینچنا چاہتا ہے، اس کا نقشہ پوری طرح نگاہوں کے سامنے ابھر جائے۔

**مثال :**

تھا کبھی دور اسیرانِ قفس اے صیّاد !!
اب تو اک پھول کو محتاج ہے گلشن کیسا
(ذوق دہلوی)

دہائی ہے دلِ درد آشنا دہائی ہے !!!
کہ آہِ سرد پہ تہمت ہے دل دکھانے کی
(یاس عظیم آبادی)

## مناسبتِ الفاظ :

### مناسبتِ الفاظ کی دوصورتیں :

(ا) لفظ کی مناسبت خیال سے (۲) لفظ کی مناسبت لفظ سے۔ پہلی صورت بلاغتِ کلام میں داخل ہے، جب کہ دوسری صورت فصاحتِ کلام میں۔ پہلی صورت کی پھر دو حیثیتیں ہیں۔ ایک مناسبت آواز کے اعتبار سے، دوسرے مناسبت معنی کے اعتبار سے۔ اس طرح مناسبتِ لفظ و معنی کی کل تین شکلیں بنتی ہیں۔ (ہماری شاعری، ص:۵۵)

**مثال :**

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمہیں منصفی سے کہہ دو تمہیں اعتبار ہوتا ؟

## شعر کی معنوی خوبیاں:

خوب صورتی، انسان کا ظاہری حسن ہے اور سیرت و کردار، اخلاقِ

فاضلہ اور صفاتِ محمودہ، اس کی باطنی خوبی ہے۔ کچھ یہی حال شعر وادب کا بھی ہے کہ اس کے اندر بھی بعض لفظی خوبیاں ہوتی ہیں اور بعض معنوی خوبیاں۔
ایک اچھے شعر یا ایک عمدہ کلام کی پہچان کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مرزا یاس عظیم آبادی لکھتے ہیں:

ایک اچھے شعر میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں۔ وزن، قافیہ، مناسبتِ الفاظ، بندش کی صفائی، محاکات (یعنی کسی چیز یا حالت کی سچی تصویر کشی) اور تخیّل۔ مگر محاکات اور تخیل، یہ دونوں چیزیں شاعری کے اصلی عناصر ہیں۔

(چراغِ سخن، ص:۵٦؛ ناشر: مجلس ترقی ادب، لاہور)

گذشتہ سطور میں ''شعر کی لفظی خوبیاں'' بیان ہو چکی ہیں۔ اب شعر کی معنوی خوبیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شعر کی معنوی خوبیاں پانچ ہیں، جس میں کمی بیشی کی گنجائش بہر حال موجود ہے۔

(۱) اصلیت (۲) سادگی (۳) بلندی (۴) باریکی (۵) تڑپ

## اصلیت :

شعر میں خیال کی اصلیت یہ ہے کہ جس چیز سے وہ خیال متعلق ہے، اس کا وجود حقیقت میں ہو یا عقل واعتقاد کی رو ممکن ہو یا مان لیا گیا ہو۔ واقعات کی دنیا میں شاعر پر ''اصلیت'' کی پابندی لازم ہے، ورنہ اس کا کلام دل پر اثر انداز نہیں ہوگا۔

## خیال کی سادگی :

خیال کی سادگی یہ نہیں کہ وہ اس قدر عام ہو اور سطحی ہو کہ ہر جاہل و عامی کی نگاہ اس تک پہنچ جائے۔ بلند سے بلند اور باریک سے باریک خیال میں بھی ''سادگی'' ہو سکتی ہے۔

### سادگیِ خیال کی مثال :

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا
(آتش لکھنوی)

## خیال کی بلندی :

خیال کی بلندی سے یہ مراد نہیں ہے کہ کوئی ایسی عجیب اور انوکھی بات کہی جائے جو معمولی سمجھ سے بالاتر ہو، بلکہ خیال رکیک اور عامیانہ نہ ہو، شریفانہ ہو اور جو جذبہ اس خیال میں شامل ہے، اس میں حیوانیت نہ ہو بلکہ انسانیت ہو۔ ہاں اگر کسی پست فطرت بندہ نفس کے خیالات دکھانا ہوں تو ان میں رکاکت، عامیانہ پن اور حیوانیت سب کچھ ہونا چاہیے، ورنہ شعر سچائی سے دور ہو جائے گا۔

مندرجہ ذیل اشعار ''بلندیِ خیال'' کی اعلیٰ مثال ہیں:

خود پرستی مٹ گئی ، قدرِ محبت بڑھ گئی
ماتمِ احباب ہے ، تعلیم روحانی مجھے !!

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بد نصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

(یاس عظیم آبادی)

## خیال کی باریکی :

اس سے یہ مراد ہے کہ خیال سطحی نہ ہو بلکہ انسانی فطرت کے گہرے مطالعے اور کائنات کے وسیع مشاہدے کا نتیجہ ہو۔ عام فہم بات اور سیدھے سے خیال کو پُر پیچ بنا کر پیش کرنا، شعر میں کوئی دور از کار استعارہ یا استعارہ در استعارہ استعمال کرنا، خلافِ قیاس مبالغے سے کام لینا، یہ خیال کی باریکی نہیں بلکہ طرزِ ادا کی پیچیدگی ہے، جو شعر کا حسن نہیں، عیب ہے۔

### باریکیٔ خیال کی مثال :

اب عشق کو درکار ہے اک عالمِ حیرت
کافی نہ ہوئی وسعتِ میدانِ تمنا

(حسرت موہانی)

کہاں کہاں دلِ مشتاقِ دید نے یہ کہا
وہ چمکی برقِ تجلّی ، وہ کوہِ طور آیا

(داغ دہلوی)

## تڑپ :

تڑپ سے مراد یہ ہے کہ کلام میں خیال کے ساتھ جذبات بھی شامل ہوں۔ یہ صفت اگر خیال میں موجود نہ ہوگی تو تمام خوبیوں کے باوجود شعر ایک پیکرِ بے جان و روح اور ایک گُلِ بے رنگ و بو رہے گا۔ خیال کتنا ہی سچا، سادہ،

بلند اور باریک کیوں نہ ہو، اگر اس میں تڑپ یعنی سوز و گداز اور دلی جذبات شامل نہیں تو وہ شاعرانہ خیال نہ ہوگا، بلکہ حکیمانہ یا واعظانہ خیال ہوگا۔

میر تقی میر کا یہ شعر تڑپ اور سوز و گداز کا بہترین نمونہ ہے۔

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

(میر تقی میر)

(ہماری شاعری، ص: ۳۷-۳۸؛ مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ)

شاعری: جذبات و احساسات کے جمالیاتی اظہار کے سبب ایک قسم کی مصوّری و صنعت گری ہے، جس میں شاعر کا سوزِ دروں اور خونِ جگر شامل ہوا کرتا ہے۔ اشعار کی شکل میں جذبات کے اظہار کا پہلا مرحلہ ''انتخابِ الفاظ'' اور دوسرا مرحلہ ''ترکیبِ الفاظ'' کا ہے۔ اسلوب بیان کی جدّت و ندرت اور دیگر خوبیوں کا مرحلہ بعد میں آتا ہے۔ اس لیے شعری محاسن کے ضمن میں انتخابِ الفاظ و ترکیبِ الفاظ سے متعلق مندرجہ ذیل امور کا لحاظ ضروری ہے:

(۱) الفاظ نامانوس نہ ہوں (۲) پامال نہ ہوں (۳) تلفظ میں کوئی دشواری نہ ہو (۴) محلِ استعمال میں ابتذال اور سوقیت نہ ہو (۵) اگر قاری و سامع پر نفرت و کراہیت کی کیفیت پیدا کرنا مقصود نہیں ہے تو ان اشیاء یا افعال کے نام نہ ہوں، جن سے ذوقِ انسانی فطرتاً متنفّر ہے یا جس کا اظہار انسان کا ملکۂ حیا گوارا نہیں کرسکتا (۶) الفاظ کی باہمی ترکیب میں اس امر کا خیال ضروری ہے کہ حرکات و آواز ایک طرف تو کلیۃً باہم متصادم نہ ہوں کہ تنافر پیدا ہو اور دوسری طرف اس قدر یکسانی بھی نہ ہو کہ لطف تنوّع جاتا

رہے ، بلکہ پستی و بلندی ،سبکی و گرانی ، زور ونزاکت ، رقت و جزالت اس توازن وتناسب کے ساتھ باہم دگر دست وگریباں ہوں کہ ایک کو دوسرے سے ممتاز کرنا دشوار ہو جائے۔(۷ ) حتی الامکان کلام کا آغاز کسی ثقیل لفظ سے نہ ہو اور خاتمہ کسی منقطع اور بھدی آواز پر نہ ہو۔(۸ ) حتی الوسع ترکیب میں ندرت ہو،مگر شگفتگی اور لطافت ہاتھ سے نہ جائے۔(۹ ) محل استعمال ایسا نہ ہو جس سے کوئی رکیک پہلو نکلتا ہو۔(۱۰) ہر حالت میں لطافتِ ذوق اور اعتدالِ صحیح کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔یہ نہ ہو کہ زورِ بیان چیخ کی حد تک پہنچ جائے ،شکوہِ الفاظ ،طبلِ بلند بانگ کا مصداق بن جائے ، متانت و سنجیدگی ، خشکی و پژمردگی کی مترادف بن جائے اور رنگین بیانی ،نسائیت اور عریانیِ خیال کا روپ دھار لے۔شعر کا خطاب شریف ترین انسانی جذبات سے ہوتا ہے،اس لئے شعر کی موسیقی بھی شریفانہ ہونی چاہیے۔

(مقدمہ نشاطِ روح،ص:۴۱-۴۳)

## کلامِ نور کے ادبی محاسن :

سید نور الحسن نورؔ نوابی ایک عظیم فنکار اور فطری شاعر ہیں ، جن کی تراوشِ افکار تشنگانِ ذوق کے لئے آبِ حیات کا درجہ رکھتی ہے۔وہ جس اقلیمِ سخن کے حکمراں ہیں ، وہ حسن و دلکشی سے معمور ہے۔ان کے کلامِ بلاغت نظام میں ادب کی جلوہ سامانیاں نگاہوں کو خیرہ کرتی ہیں۔فصاحت و بلاغت ، ابلاغِ فکر ونظر ،نازک خیالی ،احساسِ جمال کی قوت ،عشق کا جوش وخروش ، بلیغ استعارات ،خوبصورت تشبیہات ، زبان و بیان کے طرقِ استعمال پر فنکارانہ

قدرت، لفظیات کی سنجیدگی، معنی آفرینی، مترنم بحور، صوتی حسن وغیرہ۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو ان کی شاعری میں ابھرے ہوئے نقوش کی طرح نمایاں ہیں۔ انہوں نے اپنی نعتیہ شاعری میں ہیئت، صنف اور وزن کے نئے نئے تجربے کئے ہیں اور اس صنف کی سنگلاخ زمین میں روایت کی پاس داری کے ساتھ درایت اور جدّت وندرت کے گل بوٹے کھِلائے ہیں۔

موصوف اعلیٰ درجہ کے نعت گو شاعر ہیں۔ اردو کے متقدمین نعت گو شعراءً جنہوں نے صحیح معنوں میں اس مبارک صنف کو شاعرانہ حسن آفرینی کے ساتھ ساتھ شانِ برگزیدگی عطا کی ہے، جنابِ نوران میں سے ایک ہیں۔ وہ نعت گوئی کے شرعی آداب اور اس کے ادبی و صنفی تقاضوں سے آشنا ہیں، اس لئے ان کے کلام میں اعتدال وتوازن اور حزم واحتیاط کا نکھرا ہوا رنگ پایا ہے۔

انہوں نے الوہیت ونبوت کے لطیف فرق کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے نہایت بلیغ انداز میں نعتیہ شاعری کی ہے۔ ان کا کلام شاعرانہ نازک خیالیوں سے معمور ہے۔ ان کے یہاں اسلوب کا تنوّع اور تخیّل کی رنگارنگی ہے۔ حسنِ الفاظ و معانی کے التزام کے ساتھ بیان کی جدّت و ندرت، سادگی اور صفائی و برجستگی نے ان کی شاعری کو ساحری کا اعجاز بخشا ہے۔

اس مختص تمہید کے بعد اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہیں اور ''کلامِ نور کے ادبی محاسن'' کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔

کسی بھی شاعر کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے وقت دیگر محاسنِ شعری سے قطعِ نظر پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا ان کا کلام فصیح و بلیغ ہے یا نہیں؟ اس جہت سے جب ہم کلامِ نور کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کا نعتیہ کلام، فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار پر فائز نظر آتا ہے۔

## فصاحت و بلاغت :

طبقۂ شعر و ادب میں ان دونوں لفظوں کا استعمال عام ہے۔ کسی بھی عالم، خطیب اور شاعر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''وہ بڑی فصیح و بلیغ اردو بولتا ہے۔ اس کی زبان فصیح ہے۔ فلاں شاعر کا کلام فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے''۔

فصاحت و بلاغت، شعر و ادب کے حسن و دلکشی میں اضافہ کرتی ہے اور معمولی سی تحریر (مضمون، کلام) کو زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتی ہے۔ فصاحت و بلاغت، ادب کی جان اور شعر و سخن کی آبرو ہے۔ اس کے بغیر کلام یا مضمون گویا جسم بے روح ہے۔ فصاحت کا تعلق لفظ کے حسن و خوبی سے ہے اور بلاغت، معنوی حسن و خوبی سے بحث کرتی ہے۔ اس مفہوم کو ایک شاعر نے اس طرح واضح کیا ہے:

اثر ہو سننے والوں پر بلاغت اُس کو کہتے ہیں
سمجھ میں جلد جو آئے فصاحت اس کو کہتے ہیں

لیکن جب ''بلاغت'' کا لفظ الگ طریقے سے اصطلاح کے طور پر بولا جاتا ہے، تو اس وقت اس سے وہ فن یا علم مراد لیا جاتا ہے جو ''علمِ معانی، علمِ بیان اور علمِ بدیع'' پر مشتمل ہو اور جس کی بدولت کلام دلکش اور مقتضائے حال کے مطابق بنتا ہے۔

فصاحت و بلاغت کی حقیقت کا تجزیہ کرتے ہوئے سجاد مرزا بیگ دہلوی لکھتے ہیں:

ایسا کلام جو اہلِ زبان کے روز مرّہ کے موافق ہو اور تنافر حروف ،

غرابت، مخالفتِ قیاسِ لغوی ونحوی اور تعقید وغیرہ تمام عیوب سے کلام کا پاک ہونا ''کلامِ فصیح'' کہلاتا ہے اور کلام کے اس وصف کو ''فصاحت'' کہتے ہیں۔ فصاحت کا تعلق زیادہ تر الفاظ سے ہے اور اس کا پہچاننا ذوقِ سلیم پر منحصر ہے۔ لفظوں کی ذراسی الٹ پھیر یا ایک لفظ کی جگہ دوسرا ہم معنیٰ لفظ عبارت میں رکھ دینے سے کلام میں فصاحت آجاتی ہے۔ گویا فصاحتِ کلام کے لئے لفظوں کی ترتیب باہم ایسی ہو اور ایک لفظ کا تلفظ دوسرے لفظ کے تلفظ سے ایسی مناسبت اور توازن رکھتا ہو، جیسے باجے کی آوازیں باہم متناسب ہوتی ہیں، تاکہ لفظوں کی مجموعی آواز کانوں کو بھلی معلوم ہو۔ کلام میں اثر پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ وہ فصیح ہونے کے علاوہ مقتضائے حال کے موافق نہ ہو اور ایسا کلام جس میں فصاحت اور مقتضائے حال کی موافقت پائی جائے ''کلامِ بلیغ'' کہلاتا ہے اور کلام کے اس وصف کو ''بلاغت'' کہتے ہیں۔ کسی مضمون کے بلیغ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے الفاظ برمحل، فقرات برجستہ اور پورے مضمون کا خاکہ مرتب ومکمّل ہو۔ مضامین کے مختلف حصّوں کی توضیح مناسب اور کل مضمون ایسا دل آویز ہو کہ دوسروں کے دل پر بھی وہی اثر ڈالے جو مقرر، مصنّف یا شاعر کا منشا ہے اور انتہائے کمال یہ ہے کہ جو کیفیت متکلم کے دل پر گذر رہی ہے، وہی مخاطب پر بھی طاری ہوجائے۔ اس طرح بلاغت اپنے خیالات کو قابلیت کے ساتھ ظاہر کرنے کا فن ہے، تاکہ دوسرے بھی کسی مضمون کو اسی آب وتاب، اسی صفائی، اسی جوش وخروش اور اسی حسن وخوبی کے ساتھ ملاحظہ کرسکے، جو مصنف یا شاعر کی نظر میں ہے۔ بلاغت ایک ایسا فن ہے جس کے لیے بہت مشق اور مطالعہ کی ضرورت ہے۔ بلاغت کے آلات، الفاظ، جملے، فقرات اور صنائع وبدائع ہیں۔ بلاغت کی شان یہ ہے کہ سامع یا ناظر کو متعلقہ مضمون سے صرف

معلومات ہی حاصل نہ ہوں، بلکہ یہ ایسی دلچسپی بھی پیدا کرے جو مخاطب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے، اس کے جذبات کو ابھارے اور دل پر اثر ڈالے اور یہی وہ فن ہے جو علم ادب کو خوشنما اور دلکش بناتا ہے۔

(تسہیل البلاغت، ص:۱۹۳، ۲۰۱، مطبوعہ: نظام دکن پریس، حیدرآباد)

## علامہ شبلی نعمانی کے بقول :

علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ ’’لفظ میں جو حروف میں آئیں، ان میں تنافر نہ ہو، الفاظ نامانوس نہ ہوں، قواعدِ صرفی کے خلاف نہ ہو‘‘۔

(موازنۂ انیس و دبیر، ص:۳۴؛ ناشر: لالہ رام نرائن لعل بک سیلر، الٰہ آباد)

بلاغت کی تعریف علمائے معانی نے یہ کی ہے کہ کلام اقتضائے حال کے موافق ہو اور فصیح ہو۔ مقتضائے حال کے موافق ہونا، ایسا جامع لفظ ہے جس میں بلاغت کے تمام انواع و اسالیب آ جاتے ہیں۔ (ایضاً، ص:۵۳)

بلاغت کی تعریف میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ’’کلامِ اقتضائے حال کے موافق ہو‘‘، اس کا مطلب یہ ہے کہ موقع و محل کی مناسبت سے گفتگو کی جائے۔ مثلاً: اگر سامع مضمونِ خبر میں شک و تردّد نہ رکھتا ہو اور گفتگو یا کلام کے ذریعے دی گئی خبر میں صدق و کذب سے خالی الذہن ہو تو وہاں خبر کا ذکر صیغۂ تاکید کے ساتھ نہ کیا جائے۔ اور اگر سامع مضمونِ خبر میں تردد اور شک کرنے والا ہو تو وہاں خبر کا ذکر صیغۂ تاکید کے ساتھ کیا جائے اور اگر سامع نہ صرف یہ کہ متردد اور شک کرنے والا ہو، بلکہ خبر کا منکر بھی ہو، تو وہاں سامع کے انکار کی قوت کے لحاظ سے متکلم پر صیغۂ تاکید لانا واجب ہوگا۔ پس جو شخص زید کے آنے یا نہ آنے سے خالی الذہن ہو، اس خبر کے بارے میں

متردّد نہ ہو، اس وقت اس کے سامنے صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ''زید آیا''۔ اور اگر سامع اس خبر کے بارے میں قدرے شک کرنے والا ہو تو اس وقت کہا جائے گا: ''بیشک زید آیا'' اور جو زید کے آنے کا سرے سے منکر ہو تو اس وقت اقتضائے حال کا تقاضا ہوگا کہ کہا جائے: ''خدا کی قسم! بیشک زید آیا'' اور یہی بلاغت ہے، یعنی کلام کا حال و مقام کے مناسب و موافق ہونا۔

## فصیح کلام کی خصوصیات :

(۱) الفاظ فصیح ہوں، مبتذل اور سوقیانہ (بازاری لب و لہجہ) نہ ہوں۔

محاورات میں جو بھی الفاظ ہوں گے، وہ محاورے کی حد تک فصیح ہوں گے۔

(۲) کلام میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے، ان کی ساخت، نشست اور حالت کے ساتھ خاص توازن اور تناسب ہو۔ الفاظ ایک قسم کا سُر ہیں۔ ان میں غنائیت اور Organicraythm ہوتا ہے۔ سُروں کے مجموعے کا نام راگ ہے اور الفاظ کے حسنِ صورت کا نام ''آہنگ'' ہے۔ اس لیے شعر میں میں موسیقی اور غنائیت پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مصرعوں میں وہی الفاظ جمع کئے جائیں جن کے آہنگ میں ہم آہنگی موجود ہو، یعنی الفاظ کی لطافت و شیرینی، شگفتگی اور روانی اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک اس کے گرد و پیش کے الفاظ میں مناسبت ہو۔ اسی تکنیک کے ذریعہ بعض غیر مانوس الفاظ کو مصرعوں میں ایسا بٹھایا جاتا ہے کہ وہ سادہ، شستہ اور سُبک بن

جاتے ہیں اور اس طرح پورا مصرع یا شعر فصیح بن جاتا ہے۔

(۳) فصیح کلام میں الفاظ کی ترتیب، کلام کی اصلی ترتیب پر قائم رہتی ہے۔ یعنی الفاظ کی ترتیب وہی رہتی ہے جو عام بول چال کی رہتی ہے۔ مثلاً: فاعل، مفعول، مبتدا، خبر اور متعلاتِ فعل جس ترتیب کے ساتھ روزمرہ اور بات چیت میں آتے ہیں۔ اگر وزن، ردیف و قافیہ کی قید سے اصلی ترتیب پوری طرح سے قائم نہ رہ سکے تو اس کے قریب قریب پہنچ جانا ضروری ہے۔

(۴) فصیح کلام میں عموماً مضامین کی نوعیت سے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ الفاظ اپنے حروف کی ساخت کی وجہ سے مختلف قسم کی آواز کی مانند ہوتے ہیں۔ جیسے: بعض آوازیں نرم، شیریں، دلربا، لطیف، خوش گوار اور بعض ناگوار، تلخ، سخت اور سنگین معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح الفاظ بھی رعب دار، نرم، سخت، شیریں، تلخ، لطیف، سنگین اور پُرنشاط و غم انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا شعر و کلام کی فصاحت برقرار رکھنے کے لیے الفاظ کو ان کے مراتب کے لحاظ سے استعمال کرنا ضروری ہے۔

(۵) فصیح کلام عموماً روزمرہ اور محاوروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

فصاحت و بلاغت کے مذکورہ بالا اصول و شرائط نگاہوں کے سامنے رکھیں اور غور و فکر سے مندرجہ ذیل متفرق ''اشعارِ نور'' کا مطالعہ کریں، آپ کو ہر شعر بلکہ ہر مصرع میں فصاحت و بلاغت کے آب دار موتی چمکتے نظر آئیں گے۔ حقیقت و صداقت، عشق و عقیدت، جوشِ بیان، لطفِ تشبیہ، خوبیِ استعارہ، صنائع و بدائع، سادگی و برجستگی وغیرہ سب کچھ نظر آئیں گے۔ اور ایک شعر بھی ایسا نہیں ملے گا، جس پر فنی اعتبار سے انگلی رکھی جا سکے۔

(رموزِ شاعری، ص:۳٦، القمر انٹرپرائزز، لاہور)

## فصیح و بلیغ کلام :

تو لازوال ، تیرا ہنر لازوال ہے
تیری عطا یہ سارا جہانِ کمال ہے
پھولوں کو خوشبوؤں کا اثاثہ تری عطا
ہر برگ ، ہر ثمر میں ترا ہی جمال ہے
اے خدائے کن ! پرِ پرواز ایسا دے مجھے
جو شہِ کونین کی چوکھٹ پہ پہنچا دے مجھے
سنگِ شہرِ مصطفیٰ کو یوں حقارت سے نہ دیکھ
تاجِ سر میرے لیے ہے عزت و توقیر کا
دل کے گلزار سے ہوگا نہ بہاروں کا گذر
عشقِ سرکار کا پیوست اگر تیر نہیں
ٹوٹی چٹائی مسندِ سرکار ہے ، مگر
لپٹی ہوئی ہے رفعتِ افلاک پاؤں میں
انوارِ مدینہ سے مرا ذہن ہے روشن
مہتاب ہے انگشت بدنداں مرے آگے
فردوس کا نمونہ بہر اعتبار ہے
سرکار کا مدینہ بڑا شاندار ہے
غیر ممکن ہے ان کے ہوتے ہوئے
میرے پیچھے کوئی بلا آئے

پڑھتی ہے کائناتِ کے سرکار پر درود
چاہے کوئی بھی شاخِ گلستاں اٹھائیے
ہے دامنِ شفیعِ اُمم میرے ہاتھ میں
اب فکر کچھ نہیں مجھے یومُ النشور کی
ہزار سنگ چلیں زخم زخم ہو پیکر
مگر نبی کے لبوں سے دعا نکلتی ہے
ادنیٰ سا یہ اعجاز ہے آقا کی نظر کا
سورج نے بھی جو روئے سفر موڑ دیا ہے
کردارِ گہر بار کی تلوار چلا کر
سرکار نے دشمن کا بھی دل جیت لیا ہے
سرکار کے اشارۂ ابرو کے فیض سے
تلوار بن کے چلتی تھیں شاخیں کھجور کی
مہتاب بھی حسرت سے جسے دیکھ رہا ہے
وہ سرورِ کونین کا نقشِ کفِ پا ہے
ہر رہ گذرِ شوق ہے اس واسطے روشن
حاصل مجھے سرکار کی مدحت کا دیا ہے
گلیاں ہیں نور بار، فضا مشک بار ہے
کتنا نظر نواز نبی کا دیار ہے
دیکھو جدھر بھی شہرِ رسالت پناہ میں
ہر خطّہ باغِ خلد کا آئینہ دار ہے

غازہ بنا لوں چہرۂ ایماں کے واسطے
پاؤں جو تھوڑی خاک تری رہ گزار کی
حضور کے درِ رحمت کی بات کیا کہنا
کھڑے ہوئے ہیں سلاطین بھی گدا کی طرح
چشمِ خیال میں ہے سراپا رسول کا
کرتا ہوں ہر گھڑی میں نظارہ رسول کا
کرنیں جہاں سے پھوٹ رہی ہیں حیات کی
وہ چاند جیسا نقشِ کفِ پا انہیں کا ہے
ہر اوج مری خاکِ قدم چوم رہا ہے
دہلیزِ شہنشاہِ دوعالم پہ کھڑا ہوں
نبی کے نقشِ پا ہیں تاج گردوں کے
عمامہ عرش کا ہے گنبدِ خضریٰ

☆☆☆

## قافیے کا کلیدی استعمال :

قافیہ شعر کو خوش رنگ بنانے کے ساتھ اس کے معنوی حسن میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ شاعری میں قافیہ کی بڑی اہمیت ہے۔ ردیف آبشار کی مانند ایک رَو میں بہتی جاتی ہے، نت نئے معانی کی تخلیق تو دراصل قافیہ کرتا ہے۔ ردیف، فضا مہیا کرتی ہے اور قوافی مضامین سجھاتے ہیں۔ فنی اہمیت قافیے کی ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ردیف دراصل قافیے ہی کی توسیع ہے۔ قوافی کا بہتر انتخاب اور اشعار کے سانچے میں انہیں دیدہ ریزی کے ساتھ ڈھالنا،

شاعر کی مہارتِ فن کو ظاہر کرتا ہے۔ عروض کی اصطلاح میں ’’شعر یا مصرع کے آخر میں آنے والے ہم وزن الفاظ کو قافیہ کہتے ہیں‘‘۔ جیسے بلبل کا قافیہ سنبل، رضا کا قافیہ وفا، بادل کا قافیہ پاگل وغیرہ۔ حرفِ روی، حرفِ ردف، حرفِ قید، حرفِ تاسیس، حروفِ قافیہ کہلاتے ہیں۔ مروّجہ شعری اصول کی روشنی میں قافیہ کی شرط ہے کہ وہ ملفوظی ہو، یعنی جب اسے لکھا جائے تو آواز ایک ہی طرح کی نکلے، لیکن لفظ کی شکل قدرے مختلف ہو۔ لیکن اتنی مختلف نہ ہو کہ وہ حرف یا وہ حروف جن میں ہر قافیہ کی بنیاد ہے، وہ بھی مختلف ہو جائیں۔ جیسے: ’’بادل‘‘ کا قافیہ ’’مقتل‘‘ تو ہوسکتا ہے، لیکن ’’خاص‘‘ کا قافیہ ’’آس‘‘ اور ’’بات‘‘ کا قافیہ ’’احتیاط‘‘ نہیں ہوسکتا۔ عروض کی شریعت کا اصل مسئلہ تو یہی ہے، لیکن اب ’’صوتی قافیہ‘‘ کا چلن بھی دن بدن عام ہوتا جارہا ہے۔

الفاظ کی سحر کاری اور قوافی کی نغمگی مسلّم ہے۔ شاعری میں قافیے کا کلیدی استعمال بڑی اہمیت کا حامل مانا جاتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے، جب کہ شاعر کے پاس الفاظ کا اچھا خاصہ ذخیرہ ہو، مترادفات و متضاد کلمات اس کے پیشِ نظر ہوں۔ متروکات سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔ الفاظ کا خزانہ پاس رکھے بغیر شاعری کے میدان میں آنے کا نتیجہ ہوتا ہے ’’محدود الفاظ کا الٹ پھیر‘‘، جس سے نہ شعر میں ظاہری حسن پیدا ہوتا ہے اور نہ اس کی معنوی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک قادر الکلام شاعر کے پاس الفاظ کا کثیر سرمایہ ہوتا ہے اور وہ موقع و محل کی مناسبت سے بڑے حسین، دلکش، اور پُرشکوہ الفاظ کا استعمال کر کے اپنے کلام کو فصاحت و بلاغت اور حسن و ملاحت کا آئینہ دار بنا دیتا ہے۔ لہٰذا شعر و سخن کے لیے ضروری ہے کہ شاعر کے پاس الفاظ کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہو۔ شاعری، جو کہ بعض محققین کے نزدیک صرف تخیّل اور

محا کات کا نام ہے۔ ( جیسا کہ مرزا یاس عظیم آبادی نے لکھا ہے ) وہ بھی شاعری میں اکثارِ الفاظ (الفاظ کی کثرت ) کو ضروری سمجھتے ہیں۔

علامہ سید سلیمان اشرف بہاری اپنی بلند پایہ تصنیف ''الانھار'' میں لکھتے ہیں:

( شاعری میں ) تخیّل و محاکات اس وقت تک اپنا فرض پورا ادا نہیں کر سکتے ، جب تک ان کے ( شاعر ) پاس الفاظ کا کافی ذخیرہ نہ ہو۔ تا کہ نازک سے نازک پہلو بھی واقعہ کا قلّتِ الفاظ کے سبب چھوٹ نہ جائے یا لطیف سے لطیف جذبہ صرف الفاظ کی کمیابی کی نذر ہو کر ظاہر ہونے سے رہ نہ جائے۔

( الانھار ، یعنی مقدّمہ مثنوی ہشت بہشت ، ص : ٦ ، نوریہ رضویہ پبلشنگ ، لاہور )

استاذ شاعر جناب سید نور الحسن نور صاحب کی قادر الکلامی اور باوقار شاعری کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ ان کے دسیوں کلام ایسے ہیں جس میں قافیے کا کلیدی استعمال ان کی شعری لیاقت اور لسانی عظمت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ زبان و بیان اور اس کے اسالیبِ اظہار پر انہیں پوری قدرت حاصل ہے۔ اردو محاورات ، کہاوت ، روز مرّہ اور الفاظ کے پیچ و خم سے وہ خوب اچھی طرح آگاہ ہیں۔ موصوف کی شاعری پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ ان کے سامنے دست بستہ کھڑے ہیں اور اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ راقم کے مطالعے میں اب تک ان کے پانچ نعتیہ مجموعہ ہائے کلام آ چکے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ہر ایک مجموعے میں الفاظ کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ سبحان اللہ ، کیا کہنا! دیگر محاسن سے قطع نظر اگر صرف زبان کا چٹخارہ لینے کے لئے ہی ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو نو آموز شعراء اپنی قوتِ حافظہ

میں الفاظ کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ جمع کر سکتے ہیں۔

آج کل بالعموم دیکھا یہ جاتا ہے کہ رحمت، جنت، مدحت یا وفا، جفا رہا یا غنچہ، صدقہ، لمحہ یا روشنی، نغمگی، تیرگی وغیرہ قوافی پر شعراء حضرات اشعار کے انبار لگا دیتے ہیں اور جہاں مصرعے میں احتیاط، انبساط یا مضبوط، مخبوط وغیرہ کا قافیہ آتا ہے تو فوراً '' قافیہ تنگ'' ہونے والا محاورہ صادق آنے لگتا ہے، لیکن نور صاحب کی قدرتِ فن دیکھیے کہ وہ اس قسم کے دشوار قوافی میں بھی بڑی آسانی اور سلاست و برجستگی کے ساتھ دس بارہ پندرہ اشعار نکال لے جاتے ہیں۔قوافی کے کلیدی استعمال کا گر زبان و بیان پر قدرت کے نتیجے میں آتا ہے۔ یہ زبان و بیان پر مکمل دسترس ہی کا نتیجہ ہے کہ کلامِ نور میں اردو محاورات کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ایک محتاط اندازے کے مطابق راقم کے پیش نظر پانچوں مجموعہ کلام ( قلزمِ نور، مطلعِ نور، مرکزِ نور، ثنا کی نکہتیں ۔ مجموعہ نعت بر زمین غالب۔ وسلموا تسلیما ) میں تین سو سے زائد اردو محاورات استعمال میں لائے گئے ہیں۔خود راقم نے زیرِ نظر کتاب میں نمونے کے طور پر پچاس کے قریب اردو محاورات پر روشنی ڈالی ہے۔

نور صاحب کی شاعری میں یوں تو دسیوں کلام ایسے ہیں، جن میں قافیے کا کلیدی استعمال ہوا ہے۔لیکن اختصار کے پیش نظر ہم صرف پانچ کلام منتخب کرتے ہیں اور نمونے کے طور پر نادر اور کلیدی استعمال والے قوافی سپردِ قرطاس کرتے ہیں، لیکن اس سے پہلے ان قوافی کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، جن کا استعمال شاعر نے بڑی مہارت وسلاست کے ساتھ کیا ہے اور اسے ہم بجا طور پر '' قافیے کا کلیدی استعمال'' کہہ سکتے ہیں۔

(۱) احد، سند، رسد، لحد، کد، قد، خرد، حسد، اشد، وغیرہ سے متعلق

قافیے۔

(۲) کونین، نعلین، ثقلین، حرمین، مابین، دارین، قوسین، بے چین، حسنین وغیرہ سے متعلق قافیے۔

(۳) انبساط، احتیاط، بساط، انضباط، محاط (محیط اسم فاعل کا صیغہ مفعول) انحطاط، نشاط، صراط، ارتباط، اشتراط، اختلاط،

(۴) مربوط، مضبوط، مخلوط، مشروط، منقوط، مخطوط، مسقوط، مفروط وغیرہ سے متعلق قافیے۔

(۵) مفہوم، منظوم، معدوم، مرقوم، نجوم، محروم، مخدوم، مظلوم، ہجوم معصوم، معلوم وغیرہ سے متعلق قوافی۔

شعر وسخن کے یہ وہ مشکل اور نادر قوافی ہیں، جنہیں اچھے اچھے شعراء ہاتھ تک نہیں لگاتے اور ان پر طبع آزمائی سے کتراتے ہیں، لیکن جناب سید نور صاحب نے ان خشک قوافی کی خشک زمین میں بڑی صفائی و برجستگی کے ساتھ افکار ومعانی کے گل ولالہ اگائے ہیں۔

## نادر قوافی کے منفرد نمونے :

دل میں جو الفتِ محبوبِ احد رکھتے ہیں
اپنی بخشش کی وہی لوگ سند رکھتے ہیں
جو سمجھتے نہیں آقائے جہاں کی عظمت
کیسے کہہ دوں کہ وہ کچھ عقل وخرد رکھتے ہیں
طاقِ انفاس پہ روشن ہیں دروں کے چراغ
"للہ الحمد" کہ سامانِ لحد رکھتے ہیں

وہ کہاں لاتے ہیں خاطر میں متاعِ کونین
شاہِ کونین سے جو حبِّ اشد رکھتے ہیں
نورؔ رہتے ہیں جو ہر وقت ثنا میں مصروف
وہی عقبیٰ کے لیے زاد و رسد رکھتے ہیں

☆☆☆

کون جانے کیا ہے رتبہ سرورِ کونین کا
عرش نے بوسہ لیا ہے آپ کے نعلین کا
آ رہی تھی ''اُدنُ منّی'' کی صدائیں بار بار
قرب بڑھتا جا رہا تھا کس قدر مابین کا
پہنچے جب آغوشِ ''او ادنیٰ'' میں محبوبِ خدا
ختم سارا ہو چکا تھا فاصلہ ''قوسین'' کا
عظمتِ قرآن و اہلِ بیت پر شاہد رسول
قول ہے ''انّی ترکتُ فیکم الثقلین'' کا
نور کے دو دو جگر پارے ہیں ان کے بخت میں
اللہ اللہ مرتبہ ''عثمانِ ذی النورین'' کا
مرشدی نوّاب کے دامانِ اطہر کے طفیل
نورؔ کے ہاتھوں میں دامن آ گیا حسنین کا

☆☆☆

نعتِ رسول لکھئے بصد شوق و انبساط
چھوٹے مگر نہ ہاتھ سے دامانِ احتیاط

حیراں ہوں کیسے ذکرِ حبیبِ خدا کروں
دریا کے سامنے نہیں قطرے کی کچھ بساط
اوصاف ان کے فہم و خرد سے ہیں ماورا
قدرت کہاں قلم میں کرے ان کا انضباط
ان کے کرم سے دہر کی ہر شے ہے فیضیاب
ان کا کرم محیط ، زمانہ ہے کُل مُحاط
ہوتا ہے دل میں نقشِ کفِ پائے مصطفیٰ
اپنی دعا میں کہتا ہوں جب ’’اھدنا الصراط‘‘
جنت کے شوق سے، نہ جہنم کے خوف سے
میں ان سے عشق رکھتا ہوں بے قید و اشتراط
’’یا ربِّ امتی‘‘ کی صدا ان کے لب پہ ہے
کس واسطے ہو نور مجھے خوفِ پلِ صراط

☆☆☆

عشق میرا شہِ طیبہ سے جو مربوط ہوا
میری بخشش کا وسیلہ بڑا مضبوط ہوا
حبِّ مولیٰ کے لیے طاعتِ محبوب ہے شرط
قربِ حق ان کے تقرّب ہی سے مشروط ہوا
نام اللہ کا بے نقطہ ہے یہ بھی دیکھو !!
نامِ محبوب ’’ محمد ‘‘ کہاں منقوط ہوا
کون کہتا ہے کہیں اسمِ جلالت ہے فقط
ہر جگہ اسمِ محمد بھی تو مخطوط ہوا

پوچھو ابلیس سے گستاخِ نبوّت کی سزا
کس بلندی پہ تھا اور کس طرح مسقوط ہوا
جب چلا قافلہ شوق مدینے کے لیے
دردِ دل نور مرا اور بھی مفروط ہوا

☆☆☆

نہ دسترس میں سلیقہ ، نہ معنیٰ و مفہوم
کریں تو کیسے کریں نعتِ مصطفیٰ منظوم
جو آئے اس درِ انور پہ ہو گئے روشن
دلوں سے تیرگیِ کفر ہو گئی معدوم
تمہارے جلوے کے شیدا تمام جلوے ہیں
تمہارا چہرہ تکے رشک سے جہانِ نجوم
یہی وہ بارگہِ رحمتِ دوعالم ہے !!!
جہاں سے بن کے نکلتے ہیں خواجہ و مخدوم
قریب تم سے ہوا ، جو ہوا خدا سے قریب
تمہارے در سے جدا جو ہوا ، ہوا مذموم
فرازِ عرش بھی ہے نور ان کے زیرِ قدم
بلندیِ شہِ والا کسی کو کیا معلوم

☆☆☆

## کلامِ نور کی منفرد ردیفیں :

ردیف کے لغوی معنی ہیں گھوڑ سوار یا سوار کے پیچھے بیٹھنے والا آدمی اور شعری اصطلاح میں ردیف سے مراد وہ لفظ یا الفاظ کا مجموعہ ہے جو قافیے کے

بعد مکرّر آئیں اور بالکل یکساں ہوں۔ ردیف کا ہر مصرعے میں ہونا لازمی نہیں ہے۔ عام طور پر یہ اشعار کے مصرعِ ثانی میں دہرائے جاتے ہیں۔ مثلاً:

کعبے کے بدر الدجیٰ تم پہ کروڑوں درود
طیبہ کے شمس الضحیٰ تم پہ کروڑوں درود

اس مثال میں ''بدر الدجیٰ'' اور ''شمس الضحیٰ'' قافیہ ہیں اور دونوں مصرعوں کے آخری فقرے ''تم پہ کروڑوں درود'' ردیف ہیں۔

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا !!

اس شعر میں تحریر و تصویر قافیہ اور لفظ ''کا'' ردیف ہے۔

ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

پابند نظم کے علاوہ اردو کے مروّجہ اصنافِ سخن میں قافیہ لازمی ہے، لیکن ردیف کا لانا لازمی نہیں۔ تاہم ردیف کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اردو کے بڑے شعرا مثلاً میر، غالب، اقبال وغیرہ نے اپنی ردیفوں کے ذریعے اپنے شعری اسلوب کے متنوع پہلوؤں کا نظارہ کرایا ہے اور ردیفوں ہی کے توسط سے اشعار کو جہانِ معنی کا سیر کرایا ہے اور خود ردیفوں کو بھی معنی کی نئی جہات دی ہیں۔ ردیف کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جس نظم میں اس کا التزام ہوتا ہے، اس نظم کے ہر شعر میں پنہاں مضمون کی ادائیگی ردیف پر ہی منحصر ہوتی ہے اور ایسے ہی موقع پر شاعر کی صلاحیت اور اس کے اسلوب کی خوبی کا پتا چلتا ہے۔ ردیفیں مختصر اور طویل دونوں طرح کی ہوتی ہیں اور یہ شاعر کی شعری حرکیت پر منحصر ہے کہ وہ کب ایک لفظی ردیف سے شعر کو بلاغت اور نزاکتِ فکر کا نمونہ بنا دیتا ہے یا طویل ردیف کا سہارا

لے کر معنویت کی تہ داری کا نمونہ پیش کرتا ہے۔

کلام میں ردیف کی انفرادیت بھی شعری حسن میں اضافہ کرتی ہے۔ نادر قوافی اور نایاب و کمیاب ردیف استعمال کرنے کی ہمّت وہی شعراء جٹا پاتے ہیں، جو ماہر و مشّاق اور کامل الفن ہوتے ہیں۔ جناب سید نور صاحب کی نعتیہ شاعری میں جہاں بہت ساری معنوی خوبیاں ہیں، وہیں ظاہری خوبیاں بھی ہیں۔ وہ اپنی انفرادیت کی پہچان ہر جگہ چھوڑ جاتے ہیں۔ انہوں نے قوافی کے کلیدی استعمال کے ساتھ ردیف کے انتخاب اور اسے کما حقہ برتنے میں اپنی انفرادی شان دکھائی ہے۔ ان کے کلام میں مفرد اور مرکّب دونوں طرح کی ردیفیں موجود ہیں، جو اپنے اندر بڑی حد تک انفرادیت رکھتی ہیں۔ خصوصیت کے مفرد ردیفوں میں ''چوکھٹ''، ''کاغذ''، ''پاؤں''، ''پاس''، ''اور''، ''پر'' وغیرہ ردیفیں تو خوب سے خوب تر ہیں۔

**مفرد ردیفیں :**

مصطفیٰ، فلک، کاغذ، چوکھٹ، سلامت، روشنی، پاؤں، مرشدی، کربلا، آج، پاس، تک، کیوں، کھُلا، اور، طرح، سر، نکلے، چلے، پر، نکلا، دیکھ، رکھیے، رہا،

**مرکّب ردیفیں:**

نعت شریف، نبی نبی، سرورِ دیں، حضور کا، گنبدِ خضریٰ، یا علی مدد، در و دیوار، مرے آگے، لیے ہوئے، بات کرو، آنکھوں میں، اچھا ہے۔

کلام میں اچھی اور انوکھی ردیف رکھنا کمال نہیں، کمال ہے اسے بحسن وخوبی نبھانا۔ سید نور صاحب نے ردیف کے حسنِ انتخاب کے ساتھ اس کے حسنِ استعمال کا بھی حق ادا کیا ہے۔

بیان کرتا ہے یہ نطق اعتلائے فلک
ہیں نقشِ پائے نبی باعثِ ضیائے فلک
مہ و نجوم ہیں خاکِ دیارِ سرورِ دیں
وگر نہ کب تھا یہ ممکن کہ جگمگائے فلک
نبی کی راہ گذر بن گیا شبِ اسریٰ
لکھا نصیب میں تھا یہ شرف برائے فلک
ردائے سرورِ کونین تیرے صدقے میں
زمین والوں پہ تانی گئی ردائے فلک
ہے دسترس میں علوئے جہانِ عزّ وشرف
کہو کہ قد پہ ہمارے نہ مسکرائے فلک
نبی کے روضے پہ اپنی نظر جمائے ہوئے
درودِ پاک کے نغمات گنگنائے فلک
سحر کے موڑ پہ بامِ افق پہ روز اے نور
چراغِ عشقِ شہِ دوجہاں جلائے فلک

اس میں شک نہیں کہ ''فلک'' کی ردیف بڑی، عمدہ اور انوکھی ہے۔ لیکن بایں معنی دشوار بھی ہے کہ معنیٰ کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے مضمون کو فلک کے مناسب ہی باندھنا ہے اور ہر حال میں ردیف کو نبھانا بھی ہے۔ جنابِ نور نے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ معنیٰ کے تسلسل کو برقرار رکھا ہے، بلکہ اسے بھرپور انداز میں نبھایا بھی ہے۔ علاوہ ازیں اپنے مخصوص زورِ بیان اور انفرادی اسلوب سے ہر شعر کو ''ادب پارے'' کا نمونہ بھی بنایا ہے۔ تیرہ اشعار پر مشتمل یہ پورا

کلام میں تشبیہ و استعارہ، ندرتِ بیان اور صفائی و برجستگی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

یا خدا دل کو مرے کر دے معطّر کاغذ
مدحِ سرکار سے ہو جائے منوّر کاغذ
جس کے سینے پہ رقم نام نبی کا ہوجائے
بزمِ عالم میں ہے وہ طاہر و اطہر کاغذ
آپ کے سامنے شرمندہ نہ ہم ہوں آقا
کاش ایسا ملے ہم کو سرِ محشر کاغذ
نقشہ گنبدِ خضریٰ جو بنایا میں نے
چومنے آ گیا اشکوں کا سمندر کاغذ
جب کسی نے بھی لکھی نعتِ شہِ کون ومکاں
نور سے ہو گیا معمور سراسر کاغذ

یہ کلام بھی حسن عقیدت، حسنِ بیان، لطفِ ترکیب اور معنیٰ آفرینی کا ایک دلکش مرقّع ہے۔ شاعر نے مقطع میں لفظ ''نور'' سے بیک وقت دو معنیٰ اخذ کئے ہیں۔ ایک نور بمعنیٰ ''روشنی'' اور دوسرا ''شاعر کا تخلص''۔ نیز کاغذ بول کر ''نامہ اعمال'' مراد لینا، مجازِ مرسل کے وصف کو ظاہر کرتا ہے۔

جلوۂ حق سے ہے پر نور تمہاری چوکھٹ
یوں ہے رشکِ جبلِ طور تمہاری چوکھٹ
کیف آگیں کیے رہتی ہے مشامِ جاں کو
بوئے جنّت سے ہے معمور تمہاری چوکھٹ

کوئی دیوانہ کہے یا کہے مجنوں مجھ کو
چومے جاؤں گا بدستور تمہاری چوکھٹ
مسئلے کیسے بھی ہوں خلقِ خدا کوئی بھی ہو
ہر اعانت میں ہے بھرپور تمہاری چوکھٹ
کچھ بھی مانگے کوئی اک لمحے میں مل جاتا ہے
یعنی قدرت کا ہے منشور تمہاری چوکھٹ
جو اٹھانے کے لئے شورِ قیامت بھی اٹھے
چھوڑنے والا نہیں نور تمہاری چوکھٹ

کلام نور میں ایک جگہ حرف تشبیہ ''طرح'' کی ردیف آئی ہے۔ تیرہ اشعار پر مشتمل اس نعت میں زبان و بیان کی دیگر خوبیوں کے ساتھ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں حرف تشبیہ ''طرح'' کو محاورے کے طور پر اسم (طرح بمعنیٰ : بنیاد) کے معنیٰ میں استعمال کیا ہے، جو شاعری کی فنکارانہ طبیعت پر دال ہے۔ مطلع اور متعلقہ شعر ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ شاعر نے ایک اردو محاورے کو کتنی صفائی کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔

زبانِ خلق پہ جاری ہے یہ صدا کی طرح
نہیں ہے کوئی بھی محبوبِ کبریا کی طرح
درود پڑھنے لگے میرے دیدہ بیتاب !!
پڑی جو دل میں مرے عشقِ مصطفیٰ کی طرح

اسی طرح وہ نعت پاک جس کی ردیف ''پر'' ہے، یہ حرف بالعموم استعلاء و بلندی کے معنیٰ میں آتا ہے اور اپنا معنی بتانے میں دوسرے کلمہ کا

محتاج ہوتا ہے۔ جناب نور صاحب نے ''پر'' ردیف والی اس نعت میں دو جگہ لفظِ ''پر'' کو ردیف کی جگہ بمعنیٰ حرف نہیں بلکہ بمعنیٰ اسم (پَر بمعنی پنکھ) استعمال کیا ہے۔ اسی طرح اس نعت پاک میں ایک مشہور اردو محاورہ ''جان پر کھیلنا'' کو بڑی برجستگی کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے، جس سے شعر کے حسن میں چار چاند لگ گیا ہے۔ یہ بھی ان کی قادرالکلامی کی دلیل ہے۔ مطلع اور متعلقہ اشعار ملاحظہ کریں:

روشن ہیں چاند نعت کے میری زبان پر
پھر کیوں نہ تذکرے ہوں مرے آسمان پر
یاد آ رہی ہے اب مجھے آقا کی زندگی
للہ تو سمیٹ لے اے دستان ! پر
ان کو غبارِ کوچہ طیبہ نصیب ہے
یوں پا گئے ہیں اور بھی اونچی اڑان، پر
آنے نہ دوں گا حرف کبھی ان کی شان پر
ہر طرح کھیل جاؤں گا میں اپنی جان پر

اسی طرح موصوف کی لکھی ہوئی وہ نعتیں جو غالب کی زمین میں ہیں ،ان میں بھی بڑی اچھی اور انوکھی ردیفیں استعمال کی گئی ہیں۔ مثلاً: کیوں'' پاؤں''، ''پاس'' اور'' تک'' جیسی نادر ردیفوں میں موصوف نے بڑی کامیاب شاعری کی ہے۔ نمونہ ملاحظہ کریں:

قافلہ سخن وری دوسری سمت جائے کیوں
نعت سے ہے مجھے شغف کوئی غزل سنائے کیوں

راہِ مدینہ طے ہو کیوں، چل کے مجھے بتا کہ یوں
سر کو قدم بنا کے پھر دل نے مرے کہا کہ یوں
اس کے لیے گدا گری کوئے نبی کی ہے بہت
نور ! غلامِ مصطفیٰ نازِ جہاں اٹھائے کیوں
چھوتا ہوں جب میں نعتِ شہِ ذوالمنن کے پاؤں
جاتے ہیں آسماں سے پرے فکر و فن کے پاؤں
یہ سوچ کر کہ قبر میں آئیں گے مصطفیٰ
''ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں''
وہ سلیقہ ہی نہیں ہوگا طلب گار کے پاس
ورنہ کیا چیز نہیں احمدِ مختار کے پاس
رنگ کا ، نور کا ، خوشبو کا ، حسیں جلوؤں کا
ایک میلہ سا لگا ہے ترے دربار کے پاس
نور تم نعت کے اشعار سناؤ تو ذرا
دل مرا اڑ کے پہنچ جائے گا سرکار کے پاس

خلاصۂ کلام یہ کہ سید نور صاحب نے جہاں مشکل اور تنگ قوافی کے باوجود شعری زمین کو آسان بنایا ہے، وہیں مشکل اور آسان نیز مختصر اور طویل ہر طرح کی ردیفوں کو فنکارانہ انداز میں برت کر سخت زمینوں میں اشعار کے رنگا رنگ پھول کھلائے ہیں۔

☆☆☆

## مضمون آفرینی و معنیٰ آفرینی :

شعر و شاعری میں مضمون آفرینی و معنیٰ آفرینی کو بڑا دخل ہے۔اس کے بغیر شاعری جسم بے روح معلوم ہوتی ہے۔علاوہ ازیں تخیل، منظر نگاری، تشبیہات و استعارات، صنائع و بدائع، سادگی و پرکاری، صفائی و برجستگی سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر صابر سنبھلی ایک مضمون میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

شاعری محض موزوں مصرعوں کے جوڑ توڑ اور ردیف و قافیے کے استعمال کا نام نہیں ہے۔اگر الفاظ کے ایسے اجتماع جس میں ردیف وقوافی تو موجود ہوں مگر تخیّل کی کارفرمائی نہ ہو اسے تُک بندی یا برائے نام شاعری تو کہا جا سکتا ہے، اعلیٰ درجے کی شاعری نہیں۔تخیل کی بلندی سے کلام میں جو خوبیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ ہیں تشبیہات و استعارات، تمام صنائع معنوی، اصلیت، باریک بینی، بلند خیالی، جذبات نگاری، جوش، دقتِ نظر، زورِ کلام، فلسفیانہ نکات، طنز، محاکات، مرقع نگاری، منظر نگاری، مطائبات، معاملہ بندی، نزاکتِ خیال، نکتہ آفرینی وغیرہم، ان خوبیوں کی وجہ سے کسی شاعر کی کوشش صحیح معنی میں شاعری بنتی ہے۔

(سالنامہ یادگارِ رضا، رضا اکیڈمی، ممبئی، ۲۰۰۴ء، ص:۴۲)

مضمون آفرینی، معنیٰ آفرینی، خیال آفرینی، یہ تینوں چیزیں شاعری میں کثرت سے استعمال کی جاتی ہیں، لیکن ان کی حقیقت و ماہیت اور ان کے مابین فرق و امتیاز پر اب تک کوئی تحریر یا کتاب نظر سے نہیں گذری ہے۔البتہ

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی کتاب ''اردو غزل کے اہم موڑ'' میں ''مضمون آفرینی'' پر ہلکی سی روشنی ڈالتے ہوئے معنی آفرینی و مضمون آفرینی کے مابین فرق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ راقم کے ناقص خیال میں یہ تینوں چیزیں ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں اور ان کے مابین کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لغت میں ان تینوں کے جو معانی لکھے گئے ہیں، وہ تقریبا یکساں اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔

لغت میں ''مضمون آفرینی'' کا معنیٰ کچھ اس طرح لکھا ہے:

ذہن سے نئی بات یا نیا خیال پیدا کرنا، کسی پرانے مضمون میں نیا پہلو نکالنا۔

''معنیٰ آفرینی'' کا لغوی معنیٰ ہے: معنیٰ پیدا کرنا، مفہوم نکالنا، مضمون آفرینی کا عمل۔

اور باعتبارِ لغت ''خیال آفرینی'' کا معنیٰ ہے: فکر یا سوچ کے نئے زاویے نکالنے یا کسی بات میں کوئی نکتہ پیدا کرنے کا عمل۔ انہیں تینوں اصطلاح سے ملتی جلتی ایک اور اصطلاح اہل ادب کے درمیان رائج و مستعمل ہے اور وہ ہے: ''نکتہ آفرینی'' جو انہیں تینوں اصطلاح سے ملتی جلتی ایک شکل ہے۔ استصوابِ رائے کے دوران ہمارے بعض احباب نے یہ عندیہ ظاہر کیا کہ:

''خیال آفرینی، بیج اور جڑ ہے۔ مضمون آفرینی درخت اور اس کی شاخ ہے اور معنی آفرینی پھول اور پھل ہیں۔ ''معنیٰ آفرینی'' کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ لفظ کے لغوی معنیٰ کچھ اور ہوں اور شاعر اس لفظ سے دوسرے معنیٰ برآمد کرے۔ جیسے: شاعر سانپ کا ذکر کرے مگر محبوب کی زلفوں کا ذکر مقصود ہو۔

بعض نے کہا: معلومات کو ترتیب دے کر مجہولات حاصل کرنا معنیٰ آفرینی ہے۔

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی تحقیق کے مطابق:

شاعری، خارجی حقیقت کو نہیں دریافت کرتی۔ کشف، الہام، وحی اور رسومیات کے ذریعے حقائق پہلے ہی دریافت اور بیان ہو چکے ہیں۔ شاعر کا کام یہ ہے کہ ان دریافتوں اور بیانات کو اپنے طور پر بیان کرے۔ شاعری اپنے طور پر کوئی بیان کائنات کے بارے میں وضع نہیں کرتی، وہ صرف بنے بنائے بیانات کو کسی مخصوص طرز سے دوبارہ بیان کرتی ہے۔'' معنی یابی'' یا ''معنیٰ بیگانہ'' کی تلاش سے یہی مراد تھی کہ اگر ہو سکے تو پہلے سے معلوم حقائق کو کسی نئے پہلو سے بیان کیا جائے یا ان کے کسی خاص پہلو پر کم یا زیادہ تاکید دے کر بیان کیا جائے یا اگر تقدیر بہت اچھی ہوئی تو کوئی بالکل نیا بیان وضع کیا جائے۔ ورنہ اتنا تو کر ہی لیا جائے کہ پرانی بات کو کسی نئ شے کے حوالے سے بیان کر دیا جائے۔ بعد میں جب ''معنیٰ آفرینی'' کی اصطلاح عام ہونے لگی اور کلام میں معنیٰ کی کثرت پیدا کرنے کا فن مقبول ہو گیا تو اس عمل کو (یعنی پرانے بیانات کو نئے رنگ میں بیان کرنے یا پھر'' اک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھوں'' کے عمل کو) ''مضمون آفرینی'' کہا جانے لگا۔

(اردو غزل کے اہم موڑ – ایہام، رعایت، مناسبت، ص:۱۴؛ غالب اکیڈمی، دہلی)

معنیٰ آفرینی و مضمون آفرینی کے درمیان فرق ظاہر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

غالب نے مومن کو ''معنیٰ آفریں'' اس معنیٰ میں کہا تھا کہ وہ نئے نئے مضامین پیدا کرتے تھے۔ ''معنیٰ'' کے یہ معنیٰ پرانے اصطلاحی معنیٰ ہیں۔ کلام میں معنیٰ پیدا کرنے کا عمل، کلام میں مضمون باندھنے سے الگ ہے۔

## مضمون آفرینی کی مثال :

کام عاشق چوں در آید بہ بغل می میرد
غنچہ بر شاخ گل ما گرہ طاعون است

طاعون کے مرض میں جو گلٹی نکلتی ہے، اسے ''گرہ طاعون'' کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس شعر کا کمال اس بات میں ہے کہ گرہ طاعون جیسا غیر شاعرانہ، دوراز کار اور بعض لوگوں کے لیے گھناؤنا موضوع لایا گیا ہے۔ چوں کہ شعر کی عبارت میں سب سے زیادہ اہم اور توجہ انگیز لفظ ''گرہ طاعون'' ہے۔ اگر یہ نہ ہوتو مصرع اولیٰ کا دعویٰ بے دلیل رہ جائے۔ لہٰذا ہم کہیں گے کہ اس شعر کا بنیادی مضمون گرہ طاعون ہے اور چوں کہ یہ مضمون بہت نرالا اور دوراز کار اور بظاہر غیر شاعرانہ ہے، لیکن اسے شعر میں کامیابی کے ساتھ برتا گیا ہے۔ اس لئے شعر مضمون آفرینی کی بہت اچھی مثال ہے۔
(ایضاً، ص:۱۵)

غالب کے یہ دونوں اشعار معنیٰ آفرینی، لطافتِ خیال اور نکتہ آفرینی کے تحت بیان کئے جاتے ہیں، جن سے ان اصطلاحات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

مضمون آفرینی و معنیٰ آفرینی کی مندرجہ بالا تشریحات پیش نظر رکھیں اور کلامِ نور میں ان کے دلکش مناظر کا مشاہدہ کریں:

جب وہ محبوبِ خدا بن کے پیمبر اترا
کاروانِ کرم و لطف زمیں پر اترا

نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ سخاوت بیان کرنے کا اس سے بہتر انداز اور کیا ہوسکتا ہے کہ آپ کی بعثتِ طیبہ کو زمین پر کاروانِ سخاوت کے نزول سے تعبیر کیا۔ آپ دنیا میں کیا آئے، گویا لطف وکرم اور جودو عطا کا کارواں زمین پر اتر پڑا اور داد و دہش کا بازار گرم ہوگیا۔ معنیٰ آفرینی پر مشتمل نور صاحب کے اس شعر کو دیکھتے ہوئے امام احمد رضا خان محدث بریلوی علیہ الرحمہ کا وہ مشہور شعر یاد آ گیا، جسے محققینِ شعر و ادب ''معنیٰ آفرینی'' کے ضمن میں ایک بے مثال نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

نعمتیں بانٹتا جس سمت وہ ذیشان گیا
ساتھ ہی منشیِ رحمت کا قلمدان گیا

بہر کیف! نور صاحب کا یہ شعر معنیٰ آفرینی کے ساتھ مضمون آفرینی کا بھی ایک گراں قدر نمونہ ہے۔

تجھ کو دلِ فسردہ جو تسکین چاہیے
ہونا بس ان کی یاد میں غمگین چاہیے

پیغمبر اعظم، محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں مشغول اور ان کے ذکر وفکر میں محو رہنا، بلاشبہہ افسردہ دل اور کبیدہ خاطر انسان کے رنج وغم کا

مداوا ہے۔ یہ ایک سیدھی سی بات ہے۔ لیکن ہمیشہ انہیں کی یاد میں محو رہنا اور انہیں کے نام کی مالا جپنا، دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر فنائیت کی حد تک ان کی یاد میں خود کو غمگین کر لینا، یہاں تک کہ قلبی راحت اور روحانی سکون کا دور شروع ہو جائے، مضمون آفرینی کی شہکار تمثیل ہے۔ گویا:

اے عشق ترے صدقے جلنے سے چھٹے سستے
جو آگ بجھا دے گی، وہ آگ لگائی ہے

اہلِ بیت اطہار اور بالخصوص سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے متعلق یہ شعر ''مضمون آفرینی'' کی اچھوتی مثال ہے۔

خونِ اہلِ بیت کی گلکاریاں تو دیکھیے
ہو گیا گلزار پل میں ریگزارِ کربلا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و کمالات اور ان کی عظمت و رفعت کا حال اللہ عزوجل کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ طائرِ فکر و تخیّل ان کی عظمت و جلالت کے عرش نشیں اشیانے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے تو موصوف کہتے ہیں:

پہنچے کبھی نہ ہاتھ وہاں تک خیال کے
کتنے عروج پر تری عظمت کے پائے ہیں

معنی آفرینی و مضمون آفرینی کے علاوہ شعر میں حسنِ ترکیب اور لطفِ محاورہ قابلِ دید ہے۔

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کے بقول: ''ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا نام مضمون آفرینی ہے''۔

اگر واقعی اسی کا نام مضمون آفرینی ہے تو عصر حاضر کے نعت شعراء

میں جناب سید نور الحسن صاحب ایک بڑے مضمون آفریں شاعر ہیں۔ کیوں کہ ایک رنگ اور ایک مفہوم کے مضمون کو انہوں نے اسلوب اور طرزِ بیان بدل بدل کر اپنی مہارت وطبّاعی کا ثبوت دیا ہے۔ مذکورہ تعریف کی روشنی میں معنیٰ آفرینی سے قطعِ نظر ''مضمون آفرینی'' کی چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

غمِ حسین میں اشکوں نے دی ہے وہ لذّت
کہ اب تو لگنے لگا مجھ کو بے مزہ پانی

کس ماہتاب نے یہ بکھیری ہے چاندنی
انوار کا ہجوم ہے غارِ حرا کے پاس

نوٹ: اس شعر میں مضمون آفرینی کے علاوہ معنیٰ آفرینی اور استعارہ کا بھی حسن ہے۔

روشن ہیں چاند نعت کے میری زبان پر
پھر کیوں نہ تذکرے ہوں مرے آسمان پر

گل اور بھی ہیں گلشنِ کونین میں لیکن
کوئی بھی گلِ قدس نہ مہکا تیرے آگے

نوٹ: اس شعر میں مضمون آفرینی کے ساتھ استعارہ تصریحیہ کی چاشنی بھی موجود ہے۔

شرارِ عشق نبی میرے آشیانے میں
چراغِ عشق جلائیں تو نعت ہوتی ہے

شعلہ اور شرارے کا کام آشیانہ جلانا ہے، لیکن شاعر کہتا ہے کہ عشقِ نبی کی بات ہی جدا ہے۔ یہ انسان کو جلاتی ضرور ہے، لیکن دل کی خلش کی آگ بجھا کر مبتلائے عشق کو سکون و راحت بخشتی ہے اور منزل مقصود کا پتہ

بتاتی ہے۔عشق کی آگ جس قدر تیز بھڑکتی ہے، جذبات کی بھٹّی میں اسی قدر اشتعال و ہیجان برپا ہوتا ہے۔لہٰذا جب شاعر کے فکر وفن کے آشیانے میں شرارِ عشقِ نبی، چراغِ عشق جلائے گا، تبھی نعت کا خاکہ اور مضمون تیار ہوگا۔یہ شعر بھی مضمون آفرینی کے ساتھ معنیٰ آفرینی کا ایک روشن استعارہ ہے۔

خیال آفرینی، مضمون آفرینی، معنیٰ آفرینی اور نکتہ آفرینی، یہ ساری چیزیں شاعر کی قوّتِ متخیّلہ کی پیدوار ہیں۔شاعر کی قوتِ فکر و خیال جتنی مضبوط اور وسیع ہوگی، ان کے کلام میں ان محاسن کی اتنی ہی بھرمار ہوگی۔ جناب سید نور صاحب وسیع فکر ونظر کے حامل شاعر ہیں۔ان کی قوّتِ متخیّلہ بلند مضامیں اور وقیع افکار وخیالات کسب کرنے میں کچھ زیادہ ہی حسّاس اور فعّال واقع ہوئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی نعتیہ شاعری میں زورِ تخیّل، معنیٰ آفرینی کی شان، نکتہ سنجی اور خالص ادبی وفنی خصوصیات جابجا نظر آتی ہیں۔

معنیٰ آفرینی کے وصف سے متّصف مزید چند اشعار نذرِ قارئین ہیں:

غازہ خاکِ درِ پاک جو مل جائے مجھے
شبِ تاریک میں عنوانِ سحر ہوجاؤں

بہت ہی معنیٰ خیز شعر ہے اور صفائی و برجستگی کی بہترین مثال ہے۔

راہ پر خار سہی ، خوف کے انبار سہی
ہم سفر ذکرِ نبی ہو تو نڈر ہو جاؤں

مجھ کو تسخیرِ دوعالم کی نہیں کچھ حاجت
میرے اللہ ! مرا نفس مسخّر کر دے

ساعتیں جتنی کٹیں ذکرِ شہِ کونین میں
شہرِ تنہائی میں وہ جینے کا ساماں ہوگئیں

وہ گدا دینے لگا ہے تاجداروں کو زکوٰۃ
مہرباں جس پر مرے آقا کی گلیاں ہو گئیں
بکھیرتا ہے بہاریں ہرا بھرا ہو کر !!!
مرے حضور جو سوکھے شجر کو دیکھتے ہیں
بصیرتوں کا اثاثہ نہیں ہے جن کے پاس
وہ لوگ صرف لباسِ بشر کو دیکھتے ہیں
تحفہ جس کا شہِ کونین کو بیحد ہے پسند
تیری آنکھوں کو میسر وہی جاگیر نہیں
تجھے اے گلِ بہاراں نہ خزاں کے ہاتھ چھوتے
شہِ دوجہاں کی مدحت جو ترا شعار ہوتا
اے نور ہر کمال ہے جن کے قدم کی دھول
وہ صاحبِ کمال و خوش اطوار آ گئے
کربلا کی ریت پر ایسا گلِ" وانحر" کھِلا
جس کے آگے ہر چمن زارِ رضا سجدے میں ہے
ہو رہی ہے فکرِ عالم ایسے سجدے پر نثار
بیوفاؤں کے علاقے میں وفا سجدے میں ہے

☆☆☆

## شاعری میں تخیّل کا مفہوم و مرتبہ :

تخیّل، روح کی آنکھ ہے جو بصیرت و روحانیت کی عینک لگا کر حقائقِ اشیاء کا نقشہ نگاہوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔ شاعری اپنے جن اوصاف

وخصوصیات کی بدولت نثر پہ فضیلت وفوقیت رکھتی ہے، ان میں سب سے اہم، مضبوط اور توانا وصف ''تخیّل'' ہے۔ تخیل کے سبب ہی شاعری، ساحری کا روپ دھارتی ہے۔ جسمِ شاعری میں اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی سی ہے۔ مرزا یاس عظیم آبادی نے اپنی تصنیف ''چراغِ سخن'' میں تخیّل اور محاکات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ شاعری کے اصلی جوہر تخیل ومحاکات ہیں۔

عبارت ملاحظہ کریں :

اگر چہ محاکات اور تخیّل دونوں چیزیں شعر کے اصل عناصر ہیں، مگر شاعری اپنے صحیح معنیٰ کے اعتبار سے دراصل تخیّل کا نام ہے۔ محاکات میں جو دلکش انداز پیدا ہوتا ہے، وہ اسی تخیّل کی بدولت ہے۔ ورنہ خالی محاکات نقّالی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ محاکات کا بس اتنا کام ہے کہ جو کچھ دیکھے یا سنے یا جس شے اور حالت سے شاعر متاثر ہو، اس کو الفاظ کے ذریعے بعینہ ادا کردے۔ لیکن ان چیزوں میں کوئی خاص تناسب پیدا کرنا یا کوئی مابہ الامتیاز شے کو دکھانا یا آب ورنگ چڑھانا ''قوّتِ تخیّل'' کا کام ہے۔

مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ تخیّل، مسلّم اور طے شدہ باتوں کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتا، بلکہ ایک ایک بات پر سوسو دفعہ تنقیدی نظر ڈالتا ہے اور بات میں بات پیدا کرتا ہے۔ گویا تخیّل، قوّتِ اختراع یا ملکہ استنباطی کا نام ہے تخیّل کے استدلال کا طریقہ عام استدلال سے الگ ہوتا ہے۔ یہ ان باتوں کو جو مختلف طریقوں سے ثابت ہو چکی ہیں، ایک نئے طریقے سے ثابت کرتا ہے۔ یہ طریقۂ استدلال ایک قسم کا منطقی مغالعہ ہوتا ہے اور حسنِ تعلیل کی صورت میں نہایت ہی نازک اور حیرت انگیز اندازِ بیان اختیار کرتا ہے۔

## زورِ تخیّل کی مثال :

سوا تیرے کسی کا دھیان آتا ہو تو کافر ہوں
دوئی جس دل میں ہے وہ دل نہیں ہے چشمِ احول ہے

(چراغِ سخن، ص:۶۴، مجلس ترقی ادب، لاہور)

الطاف حسین حالی کے الفاظ میں:

تخیّل یا ایمیجینیشن ( Imagination ) کی تعریف کرنی بھی ایسی ہی مشکل ہے، جیسی کہ شعر کی، مگر من وجہٖ اس کی ماہیت کا اندازہ ان لفظوں سے دل میں پیدا ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ ''تخیّل ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربے یا مشاہدے کے ذریعے سے ذہن میں پہلے سے مہیّا ہوتا ہے، یہ اس کو مکرّر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرائے میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے''۔

اس تقریر سے ظاہر ہے کہ تخیّل کا عمل اور تصرّف جس طرح خیالات میں ہوتا ہے، اسی طرح الفاظ میں بھی ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات شاعر کا طریقۂ بیان ایسا نرالا اور عجیب ہوتا ہے کہ غیر شاعر کا ذہن کبھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہی ایک چیز ہے جو کبھی تصوّرات اور خیالات میں تصرف کرتا ہے اور کبھی الفاظ وعبارات میں۔

(مقدّمہ شعر وشاعری، ص:۵۱-۵۲، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی)

حالی نے تخیّل کی تفہیم کے لئے غالب کے یہ دونوں اشعار پیش کئے ہیں:

ان کے آنے سے جو آ جاتی ہے رونق منہ پر
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا !!
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

حالی کہتے ہیں کہ شاعر کے ذہن میں پہلے سے اپنی اپنی جگہ یہ باتیں ترتیب وار موجود تھیں کہ مٹی کا کوزہ ایک نہایت کم قیمت اور ارزاں چیز ہے جو بازار میں ہر وقت مل سکتی ہے اور جامِ جمشید ایک ایسی چیز تھی جس کا بدل دنیا میں موجود نہ تھا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ تمام عالم کے نزدیک جامِ سفال میں ایسی کوئی خوبی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ جامِ جمشید سے فائق اور افضل سمجھا جائے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا کہ جامِ جم میں شراب پی جاتی تھی اور مٹی کے کوزے میں بھی شراب پی جا سکتی ہے۔ اب قوّتِ متخیّلہ نے ان تمام معلومات کو ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دے کر ایسی صورت میں جلوہ گر کر دیا کہ جامِ سفال کے آگے جامِ جم کی کچھ حقیقت نہ رہی۔ اور پھر اس صورتِ موجودۂ فی الذہن کو بیان کا ایک دل فریب پیرایہ دے کر اس قابل بنا دیا کہ زبان اس کو پڑھ کر متلذذ اور کان اس کو سن کر محظوظ اور دل اس کو سمجھ کر متاثر ہو سکے۔ اس مثال میں وہ قوت جس نے شاعر کی معلوماتِ سابقہ کو دوبارہ ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشی ہے، وہ ’’تخیّل یا امیجینیشن‘‘ ہے۔

(ایضاً، ص:۵۲-۵۳)

بوئے گل ، نالۂ دل ، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غالب کے اس شعر میں بھی تخیّل کا عمل کارفرما ہے کہ انہوں نے تخیل

کی مدد سے اپنے تجربے اور مشاہدے کو شعر میں ایک نئی ترتیب اور نئی صورت میں پیش کر کے اپنا پسندیدہ نتیجہ اخذ کرنے کی شاعرانہ کوشش کی ہے۔ شاعر کو معلوم ہے کہ بوئے گل، نالۂ دل اور دودِ چراغِ محفل ان تینوں میں بکھرنے یا پریشان ہونے کی صفت مشترک ہے۔ لیکن وہ اسے معشوق کی بزمِ طرب سے ناکام و نامراد لوٹنے کا نتیجہ بتاتا ہے۔ یعنی ایک عمومی مشاہدے کو ایک خصوصی صورت حال سے جوڑتا ہے اور اس مضمون سے اپنے مخصوص پیرایۂ اظہار میں وہ نتیجہ برآمد کرتا ہے، جہاں تک عام نگاہیں نہیں پہنچتیں۔

## کلامِ رضا سے تخیّل کی مثال :

خم ہوگئی پشتِ فلک اس طعنِ زمیں سے
سن ہم پہ مدینہ ہے وہ رتبہ ہے ہمارا

اعلیٰ حضرت امام رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ کے اس شعر میں بڑا عمدہ تخیل پیش کیا گیا ہے۔ اس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ جب آسمان کو اپنی بلندی پر ناز ہوا اور وہ فخر کرتے ہوئے زمین کو حقیر سمجھنے لگا تو زمین نے طنز کرتے ہوئے آسمان سے کہا: سن اے آسماں، زیادہ مت اکڑ۔ میرا رتبہ تجھ سے زیادہ بلند ہے، کیوں کہ میری گود میں مدینہ منورہ جیسا حسین و جمیل شہر آباد ہے اور اس میں وہ ذات ستودہ صفات آرام فرما ہیں، جن کے صدقے میں یہ کائنات بنی ہے۔ زمین کا یہ طنزیہ انداز سن کر آسمان کی پشت خم ہوگئی یعنی اکڑ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم آسمان کے کناروں کو زمین سے ملتے ہوئے دیکھتے ہیں تو تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آسمان خم دار یعنی ٹیڑھا اور جھکا ہوا ہے۔ زمین کا طعن سن کر آسمان کی پیٹھ کا جھک جانا، اگر چہ صنعتِ ''حسنِ تعلیل'' کا کرشمہ ہے۔ لیکن اس میں شک

نہیں کہ شاعر نے بڑا اچھوتا اور پاکیزہ تخیّل شعر میں پیش کیا ہے۔

تخیّل ایک زبردست دماغی ریاضت اور فنکارانہ عمل ہے۔ جہاں تک رسائی کے بعد غور وفکر کی پرواز ختم ہو جاتی ہے، تخیّل وہاں سے اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ ذہانت وطبّاعی اور گہری بصیرت رکھنے والے شاعر ہی کے دماغ میں تخیّل اپنا بسیرا کرتا ہے۔ تخیّل، حشر انگیز خیالات کا نقشہ اس وقت پیش کرتا ہے جب کہ شاعر، دانا و بینا، عالی دماغ اور جہاں دیدہ شخص ہو۔ زندگی کے رموز واسرار سے واقفیت کے ساتھ کائنات کا وسیع مطالعہ رکھتا ہو۔ تخیّل کی ڈور مشاہدات و تجربات سے بندھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخیّل بالعموم گہرے مشاہدات اور وسیع تجربات کے بطن سے جنم لیتا ہے۔ قدرت کی طرف سے یہ یہ دولت خال خال افراد ہی کے حصے میں آتی ہے۔

## کلامِ نور میں تخیّل کے جلوے :

سید نور الحسن نور، اردو نعتیہ ادب کا ایک مستند نام ہے، جس کی فکر انگیز نعتیہ شاعری نے پورے عہد کو متاثر کیا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کو اعلیٰ فکر و تخیل اور اعلیٰ اندازِ بیان عطا کیا ہے۔ ان کے کلام میں زورِ تخیّل، فکر کی گہرائی، صداقت و معقولیت، ادبی جمال، موضوعات و اسالیب کا تنوّع اور فکر وفن کی جمالیاتی قدریں پائی جاتی ہیں۔ پاکیزہ خیالات کے ساتھ وفورِ جذبات اور قرینہ اظہار جیسے معنوی اوصاف ان پر مستزاد ہیں۔

بکھرا ہے شش جہات میں موجِ غبارِ نور
اک بزمِ کہکشاں ہے حرم کی فضاؤں میں

چومے ہیں جس کے عرشِ معلیٰ نے پائے ناز
آگے کہیں ہے ذات وہ لفظ و بیان سے
تمنّا ہے کہ اک دن نعتِ آقا اس طرح لکھوں
شعاعِ مہر ہو خامہ ، ورق ماہِ منوّر کا
رقم سرکار کی مدحت کا اک گوشہ نہ ہو پائے
سیاہی بن کے آ جائے اگر پانی سمندر کا
بے ادب ٹھہرے نہ اشکوں کی روانی کا بھی شور
بات احساس کی بولی میں ہی بولی جائے
تمہارے رخ کی زیارت کو دن نکلتا ہے
طواف گیسوئے اطہر کا آ کے رات کرے
زبان ناخنِ پا کی ثنا سے قاصر ہے
کہاں مجال کہ شرحِ صفات و ذات کرے
دکھانی ہیں اگر خورشیدِ محشر کو تمہیں آنکھیں
بسا لو نقشِ پائے احمدِ مختار آنکھوں میں
اگر نہیں ہے مرا جام ، جامِ جم کیا ہے
غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے
سوال کرتی ہیں ویرانیاں مرے دل کی
جہاں قیام نہ ان کا ہو وہ حرم کیا ہے
جہانِ حرف و نوا میں ہو بول بالا مرا
وہ دیں کھجور کی اک شاخ تو قلم کیا ہے

نبی ہوں محوِ تبسّم تو نور ایسے میں
وجود کہتے ہیں کس چیز کو عدم کیا ہے
چولہے سے فاطمہ کے جو اٹھنے لگا دھواں
پیدا اسی کی جمع سے افلاک ہو گئے

☆☆☆

## فکری شاعری :

سید نور الحسن نور کی شاعری، ایک فکری شاعری ہے، جس میں فکر کا جمال اور فن کا کمال ساتھ ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص شعری لہجے میں جو کچھ کہتے ہیں، ان کی تہوں میں حقائق و معارف کے چشمے ابلتے ہیں۔ ان کی قوتِ تخلیق، فکری رَو کے ہمرکاب چلتی ہے اور قارئین کو ایک جہانِ معانی کی سیر کراتی ہے۔ روایت پسندی نے ہمیشہ درایت، عصری حسّیت، ابلاغِ فکر و نظر اور معانی تہہ داریوں کا گلا گھونٹا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شعری سرمائے میں فکر و درایت کم اور روایت و نقّالی کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ مقامِ اطمینان و مسرت ہے کہ اب لوگ روایت پسندی کے خول سے باہر آرہے ہیں اور فکر و درایت کی کھلی فضا میں سانس لینے لگے ہیں، جس سے زبان و ادب کا بڑا فائدہ ہو رہا ہے۔ باقاعدہ فکری شاعری کے نشانات غالب کے یہاں ملتے ہیں اور پھر یہ سلسلہ علامہ اقبال سے ہوتا ہوا عصرِ حاضر کے ان شعراء تک پہنچتا ہے جو ادب میں روایت کے ساتھ جدّت اور ترسیلِ افکار و معانی کو ترجیح دیتے ہیں۔ الحمد للّٰہ! دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ صنفِ

نعت میں بھی فکری عناصر کی شمولیت ہو رہی ہے۔ فکری نعتیہ شاعری کی نمائندگی کرنے والے عصر حاضر کے جیالوں میں ایک قابل قدر نام جناب سید نور الحسن نور نوابی کا بھی ہے جو شعر و ادب کے معاملے میں ''قدیم صالح اور جدید نافع'' کے فلسفے پر عمل پیرا ہیں اور اپنی نعتیہ شاعری کی انگوٹھی میں فکر کا نگینہ جوڑ کر اسے کامیابی سے ہمکنار کر رہے ہیں۔

فکری شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر عزیز احسن کا یہ بصیرت افروز تبصرہ ملاحظہ کریں:

فکری شاعری میں زبان و بیان کے مروّجہ ڈھانچوں سے انحراف کرنا، شاعری کی ضرورت اور شاعر کی مجبوری ہوتی ہے۔ شاعر جب کم لفظوں میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہے تو لفظوں کو لغت کی محدود دنیا سے نکال کر کائنات گیر وسعتیں دے دیتا ہے۔ توسیعِ معانی کی یہ کاوش ''فکری تخلیقات'' میں جا بجا نظر آتی ہے۔ جن شعراء کے یہاں قوتِ تخلیق ان کی فکری رَو کے ہمرکاب چلتی ہے، صرف وہی شعراء کامیاب قرار دیے جاتے ہیں۔ ورنہ محض فکر ایک طرف تو شعریت کے فقدان کا سبب بنتی ہے اور دوسری طرف اس کا ابلاغ محدود ہو جاتا ہے۔

(نعت رنگ، ۳، ص: ۲۲۹، کراچی)

نمونۂ کلام:

بلبل و گل کے تبسم سے چمکتی ہے فضا
گلشنِ نعت میں کرتے ہیں خیالات خرام
آقائے دو عالم کے گداؤں کا گدا ہوں
ہیں کاسہ بکف دہر کے سلطاں مرے آگے

حاصل ہیں مجھے بال و پرِ عشقِ پیمبر
ہے ایک قدم عالمِ امکاں مرے آگے

شہرِ طیبہ کی ہوا نے جانے کیا آ کر کہا
دل کی کلیاں یوں کھِلیں صحنِ گلستاں ہوگئیں

ٹوٹی چٹائی مسندِ سرکار ہے مگر
لپٹی ہوئی ہے رفعتِ افلاک پاؤں میں

تیرے دیدار کا اعزاز اگر مجھ کو ملے
سر سے پا تک میں محبت کی نظر ہوجاؤں

ابھی منزل کے نشانات ہیں دھندلے دھندلے
جذبہ شوق کی لَو اور بڑھائی جائے

کرنے لگیں طواف جہاں کی عدالتیں
فاروق نے وہ پائی عدالت کی روشنی

جرات نہیں کہ چھو لے مجھے مفلسی کی دھوپ
سر پہ سحابِ جود ہے تیرا تنا ہوا

ہو جائے گی اطاعتِ پروردگار بھی
دل سے جو مصطفیٰ کی اطاعت کریں گے ہم

اس لیے محشر کا شدت سے ہمیں ہے انتظار
آرزو پوری وہاں ہوگی ترے دیدار کی

(کلام سید نور الحسن نور)

جناب سید نور نے اردو نعتیہ شاعری کی فکری وفنی کائنات میں لفظوں کی معنویت، موضوع کی ندرت، طرزِ بیان کی عمدگی اور اپنے فکر انگیز معنیاتی

نظام سے نئی نسلوں کو چراغِ بصیرت دکھانے کا کام کیا ہے، جس کے اجالوں میں فکر و فن کے مسافر منزلِ مقصود کا پتہ لگاتے رہیں گے اور یہ سوال کہ ''شعر کے بے جان جسم میں شعریت و معنویت کی روح کیسے پھونکی جاتی ہے؟'' کا جواب ڈھونڈتے رہیں گے۔ ان کی شاعری کا معنیاتی نظام اپنے اندر بڑی تہہ داری اور کشش رکھتا ہے۔ موصوف کی شاعری کا اپنا ایک مزاج ہے، الفاظ کے استعمال، موضوعات کے انتخاب اور تشبیہات و استعارات کے غازوں سے عروسِ فکر کو سنوارنے میں وہ جتنی احتیاط سے کام لیتے ہیں، اُتنی ہی فکر انہیں اِس بات کی ہوتی ہے کہ اُن کے اشعار اپنی معنویت نہ کھونے پائیں۔

مندرجہ بالا اشعار میں افکار و معانی کا ایک جہاں آباد ہے، جن کی تشریح و وضاحت کے لئے کئی صفحات درکار ہیں۔

☆☆☆

# سید نور صاحب کی نعتیہ شاعری کا جائزہ :
# علمِ بیان کی روشنی میں

## علمِ بیان کی تعریف :

تشبیہ واستعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ جو کہ حسنِ کلام کے زیور ہیں، یہ سب علم بیان کے دائرے میں آتے ہیں۔ لہٰذا تشبیہ واستعارہ وغیرہ پر روشنی ڈالنے سے پہلے علم بیان سے واقفیت ضروری ہے۔ علم بیان ان اصول وقواعد کے جاننے کا نام ہے جن کی مدد سے ایک معنیٰ کو مختلف طریقوں سے ادا کرنے کا ملکہ انسان کو حاصل ہوتا ہے۔

میر انیس لکھنوی نے غالباً اسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

گل دستہ معنیٰ کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

ترجمۂ حدائق البلاغت میں ہے:

علم بیان چند ایسے قاعدوں کا نام ہے کہ ان کو اگر اس طرح یاد کرلیں کہ وہ سب ذہن میں حاضر رہیں تو ایک معنیٰ کو کئی طریقے سے ادا کر سکتے ہیں۔
(ترجمۂ حدائق البلاغت، ص:۳۰، مطبوعہ: منشی نولکشور، لکھنؤ)

کلمہ ایسا لفظ ہے جو معنیٔ مفرد (واحد) کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ یعنی لفظ کی وضع، دلالتِ معنیٰ کے لیے ہوئی ہے۔ اگر لفظ اسی معنی پر دلالت کرے جس کے لئے اس کی وضع ہوئی ہے، تو یہ معنیٔ حقیقی ہے اور اگر لفظ اپنے معنیٔ موضوع لہ کے علاوہ کسی اور معنیٰ پر دلالت کرے تو یہ معنیٔ مجازی ہے۔

حقیقی اور مجازی معنیٰ کے درمیان کوئی نہ کوئی ربط اور تعلق ضرور ہوتا ہے۔ اگر یہ تعلق تشبیہ کا ہو تو اسے ''استعارہ'' کہتے ہیں۔ اگر حقیقی اور مجازی معنی کے درمیان تشبیہ کے علاوہ کسی اور طرح کا علاقہ (سبب ومسبب، ظرف ومظروف، جزو وکل) ہو تو اسے ''مجاز مرسل'' کہتے ہیں۔ اور اگر حقیقی کے ساتھ مجازی معنی بھی مراد لیا جا سکتا ہے، تو اسے ''کنایہ'' کہتے ہیں۔ تشبیہ بذات خود مجاز کی قسم نہیں، لیکن مجاز کے ساتھ ایک خاص علاقہ رکھتی ہے، اس لئے علم بیان میں تشبیہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

## تشبیہ کی بحث :

''استعارات وتشبہات حسنِ کلام کے زیور ہیں، بلکہ سچ یہ ہے کہ نظم ونثر اور تقریر وتحریر میں جو کچھ جادوگری ہے، بہت حد تک انہیں کی بدولت ہے''۔

(موازنہ انیس ودبیر، ص:۹۵)

## تشبیہ کی تعریف :

ایک چیز کو کسی خاص وصف میں دوسری چیز کے مانند قرار دینا ''تشبیہ'' کہلاتا ہے۔ مثلاً: زید شیر کی طرح ہے۔ فاطمہ کا چہرہ چاند جیسا ہے۔ تشبیہ عربی زبان کا لفظ ہے اور لفظِ ''شبہ'' سے بنا ہے، جس کے لغوی معنیٰ مشابہت، تمثیل اور کسی چیز کو دوسری چیز کی مانند قرار دینے کے ہیں۔

تسہیل البلاغت میں ہے:

تشبیہ کے معنیٰ ہیں کسی خاص لحاظ سے ایک شے کو دوسری شے جیسا ظاہر کرنا۔

**مثال :**

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

(میر انیس)

اوس (شبنم) کے قطروں سے موتیوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس چیز کو کسی دوسری چیز سے دیں، وہ ''مشبّہ'' اور جس سے تشبیہ دی جائے وہ ''مشبّہ بہ'' کہلاتی ہے۔ اس شعر میں اوس کے قطرے مشبّہ اور موتی مشبّہ بہ ہیں۔ جو معنیٰ مشبّہ اور مشبّہ بہ میں مشترک ہو وہ ''وجہِ شبہ'' کہلاتے ہیں۔ اوس کے قطروں اور موتیوں میں آب و تاب ایسی چیز ہے کہ دونوں میں پائی جاتی ہے، یہی وجہِ شبہ ہے۔ اب رہی غرضِ تشبیہ، وہ یہ ہے کہ مشبّہ کی رفعت اور حسن یا تحقیر و ذلت یا رعب و ہیبت وغیرہ صفات ظاہر کئے جائیں۔ اس شعر میں اوس کے قطروں کی خوشنمائی اور چمک دمک ظاہر کرنا، غرضِ تشبیہ ہے۔
(تسہیل البلاغت، ص: ۱۱۱–۱۱۲، نظام دکن پریس، حیدر آباد)

## تشبیہ کے چار ارکان ہیں :

(۱) مشبّہ (۲) مشبّہ بہ (۳) حرفِ شبہ (۴) غرضِ تشبیہ

مشبّہ : جس چیز کو کسی دوسری چیز کے مانند ٹھہرایا جائے اسے ''مشبّہ'' کہتے ہیں۔

مشبّہ بہ : جس چیز سے کسی دوسری چیز کو تشبیہ دی جائے اسے ''مشبہ بہ'' کہتے ہیں۔

حرفِ تشبیہ : جس لفظ کے ذریعے ایک شے کو دوسری شے سے

تشبیہ دی جائے، اسے ''حرفِ تشبیہ'' کہتے ہیں۔

## غرضِ تشبیہ :

جس مشترک وصف کی وجہ سے ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دی جائے، اسے ''غرضِ تشبیہ'' کہتے ہیں۔

## تشبیہاتِ نور :

سطورِ بالا میں تشبیہ کی تعریف گذر چکی ہے۔ اب یہاں ہم تشبیہ کے انواع واقسام بیان کرتے ہوئے ''تشبیہاتِ نور'' پر گفتگو کرتے ہیں۔ کلامِ نور کے ادبی محاسن کا سب سے اہم، نمایاں اور شان دار پہلو یہی ہے کہ اس میں زبان وبیان کی خوبیوں کے ساتھ لطفِ تشبیہ اور خوبیِ استعارہ (جو تشبیہ کی ایک مختصر صورت ہے) قدم قدم پر موجود ہے۔ ان کا کوئی کلام تشبیہ واستعارہ سے خالی نہیں۔ ایسا نہیں کہ انہوں نے جان بوجھ کر اپنی شاعری کے میدان میں تشبیہات واستعارات کے قافلے اتار دیے ہیں، بلکہ بلا قصد واختیار کلام کو تزئین وآرائش سے ہم کنار کرنے والے یہ آلات جمع ہو گئے ہیں اور اس کے حسن ودلکشی میں اضافے کا سبب بن گئے ہیں۔

نور صاحب نے تشبیہ کے مختلف انواع واقسام سے اپنے کلام کو زینت بخشی ہے۔ تشبیہ مفرد، تشبیہ مرکب، تشبیہ مطلق، تشبیہ مرسل، تشبیہ مؤکد، تشبیہ مجمل، تشبیہ مفصّل، تشبیہ بلیغ اور تشبیہ قریب وبعید وغیرہ کا انہوں نے فنکارانہ استعمال کیا ہے۔ تو آیئے اور ''تشبیہاتِ نور'' کے جلووں سے اپنی آنکھیں روشن کیجئے:

مشبہ، مشبہ بہ، حرفِ تشبیہ اور غرض تشبیہ کے لحاظ سے تشبیہ کی متعدد

قسمیں ہیں، جن میں مشہور قسمیں یہ ہیں:

## تشبیہِ مرسل :

تشبیہ مرسل وہ تشبیہ ہے جس میں حرفِ تشبیہ کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہو۔ مثلاً : اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی مقدس کتاب قرآن میں اپنے نور کی تمثیل بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

مثل نورہ کمشکاۃ ، یعنی اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چراغ۔ اس مثال میں حرف تشبیہ ''کاف'' واضح طور پر موجود ہے۔

اردو شاعری میں تشبیہ مرسل کثرت سے رائج ہے۔ اکثر شعراء کے کلام میں اس کی مثال دیکھنے کو ملتی ہے۔ کلامِ نور میں بھی ''تشبیہِ مرسل'' کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔

نمونہ ملاحظہ کریں:

ملی جو خاکِ درِ مصطفیٰ خدا کی قسم
جبیں چمکنے لگی ماہِ پر ضیا کی طرح

خیال آیا جہاں دوریِ مدینہ کا
برس پڑیں مری آنکھیں وہیں گھٹا کی طرح

مرے رسول عطا کردیں نور کو یہ شرف
پڑا رہے ترے قدموں میں خاکِ پا کی طرح

حضور کے درِ رحمت کی بات کیا کہنا !!
کھڑے ہوئے ہیں سلاطین بھی گدا کی طرح

ان چاروں اشعار میں جبیں کو ماہِ پرضیا سے، برستی آنکھوں کو گھٹا سے

اور شاعر نے اپنی ذات کو خاکِ پا سے اور سلاطین کو گدا سے تشبیہ دی ہے اور ان چاروں جگہ مشبّہ و مشبّہ کے ساتھ حرف تشبیہ (طرح) واضح طور پر موجود ہے۔

## تشبیہ مجمل :

تشبیہ مجمل ایسی تشبیہ کو کہتے ہیں جس میں ''وجہِ شبہ'' مذکور نہ ہو۔
جیسے: ''اس کا قد، سرو ہے یا مثلِ سرو ہے''۔

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اس شعر میں محبوب کے قد و قامت کو ''سرو'' کہا گیا ہے، لیکن وجہِ شبہ مذکور نہیں ہے۔
(اردو میں علم بیان و بدیع کے مباحث: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص: ۵۵)

جتنی باتیں بھی نکلنی تھیں لبِ سرکار سے
سب ہوئیں وحیِ الٰہی، جزوِ ایماں ہو گئیں

گل اور بھی ہیں گلشنِ کونین میں لیکن
کوئی بھی گلِ قدس نہ مہکا ترے آگے

نور صاحب کے ان دونوں شعر میں تشبیہ بڑی اچھوتی ہے، لیکن وجہِ شبہ مذکور نہیں۔
نوٹ: تشبیہ مرسل بالعموم استعارہ کی شکل میں پائی جاتی ہے۔
(استعارہ، تشبیہ کی ایک مختصر صورت ہے)

## تشبیہ بلیغ :

تشبیہ بلیغ وہ ہے جس میں تشبیہ میں زور پیدا کرنے کے لیے حرفِ

تشبیہ اور وجہ تشبیہ دونوں حذف کر دیے جاتے ہیں۔ متکلم کو اس سے یہ باور کرانا مقصود ہوتا ہے کہ مشبّہ اور مشبّہ بہ میں اتنی زیادہ مشابہت ہے کہ گویا دونوں ایک ہی ہیں۔ مثلاً: دین و مذہب ہماری زندگی ہے۔ اس مثال میں دین و مذہب کو زندگی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ چوں کہ دین کی ہدایت کے بغیر زندگی کا کوئی مقصد باقی نہیں رہتا، اس لیے بات میں زور پیدا کرنے کے لیے تشبیہ کی علامت اور تشبیہ کی غرض دونوں کو حذف کر دیا جاتا ہے۔

نمونۂ کلام :

جانِ قمر ہے ، تابشِ رخسارِ مصطفیٰ
عنبر فشاں ہے ، گیسوئے خمدارِ مصطفیٰ

اس مثال میں نور صاحب نے تشبیہ بلیغ کا نمونہ پیش کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسارِ مبارک کی تابش کو ''جانِ قمر'' کہا ہے۔ یعنی آپ کے رخسار کی چمک دمک کو چاند کی روشنی سے تشبیہ دی ہے اور آپ کے خمدار گیسوئے پاک کو ''عنبر فشاں'' کہہ کر مشک و عنبر سے تشبیہ دی ہے، لیکن دونوں جگہ غایتِ مشابہت کی وجہ سے حرفِ تشبیہ اور وجہِ تشبیہ کو حذف کر دیا ہے۔

عاشقوں کے واسطے تو جنت الفردوس ہے
آپ کا صحنِ گلستاں مرشدی نوّاب شاہ

یہاں نور صاحب نے اپنے ممدوح سرکار سیدی نوّاب علی شاہ علیہ الرحمہ کے صحنِ گلستاں کو جنّت الفردوس سے تشبیہ دی ہے۔

**تشبیہ مفرد :**

تشبیہ مفرد کو تشبیہ مطلق بھی کہتے ہیں۔ اس میں مشبہ اور مشبہ بہ

دونوں مفرد ہوتے ہیں۔ جیسے: چہرہ کو چاند سے اور اور بہادر آدمی کو شیر یا رستم پہلوان سے تشبیہ دینا۔

## تشبیہ مفرد کی مثال :

نازکی ان کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

شعر میں لب کو گلاب سے تشبیہ دی گئی ہے اور مشبہ و مشبہ بہ دونوں مفرد ہیں۔

کلامِ نور میں تشبیہ مفرد کی سینکڑوں نظائر موجود ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

نصّ قرآن کی تائید ہمیں حاصل ہے
دستِ سرکار کو ہم دستِ خدا کہتے ہیں

اس شعر میں حرف تشبیہ حذف کرتے ہوئے سرکار علیہ السلام کے دستِ مبارک کو اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت سے تشبیہ دی گئی ہے۔

گلاب روضہ آقا ، گہر در و دیوار !!
چمک دمک میں ہیں رشکِ قمر در و دیوار
ایک اک گوشہ خلد منظر ہے
حسنِ طیبہ بیاں سے باہر ہے
آسماں آ کے دیکھ ان کی گلی
ذرہ ذرہ ’’ مہِ منوّر‘‘ ہے
چہرۂ والضحیٰ سے پھوٹی کرن
ہر طرف بکھرے نور کے جلوے

خیال آیا جہاں دوریٔ مدینہ کا
برس پڑیں مری آنکھیں وہیں گھٹا کی طرح
جو اتنا ہنس رہا ہے ماہِ انور
مرے آقا کا ہے یہ نقشِ پا کیا

## تشبیہِ مرکّب :

اس میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مرکب ہوتے ہیں۔ جیسے: چہرے پر بکھری ہوئی زلفوں کو بدلی میں گھرے ہوئے چاند سے تشبیہ دینا۔ جیسے ذوق دہلوی کا یہ شعر:

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی پیلِ مست بے زنجیر
( تفہیم البلاغت، ص: ۱۷، مکتبہ فریدی، لاہور )

نوٹ : تشبیہ مرکّب کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس میں مشبہ اور مشبہ بہ ایک کے بجائے دو یا چند ہوں۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ مشبہ اور مشبّہ بہ میں کوئی قید یا شرط لگی ہو۔ مثلاً:

وہ ہوا گرد سے جب وقتِ شکار آلودہ
تیرِ خاکی بنے مژگانِ غبار آلودہ

اس مثال میں مژگانِ غبار آلودہ مشبّہ مرکب ہے۔ یعنی مژگاں کے لیے غبار آلود ہونے کی قید ہے اور تیرِ خاکی مشبّہ بہ مرکب ہے یعنی تیر کے لیے خاکی ہونے کی قید و شرط ہے۔

کلام نور میں تشبیہ مرکب کی جلوہ ریزیاں ملاحظہ کریں:

ترے کوچے کا اک چھوٹا سا پتھر
ہے گنجِ شائقاں خاتونِ جنت

یہاں پتھر کو گنج سے تشبیہ دی گئی ہے۔ پتھر مشبّہ ہے اور گنج مشبّہ بہٖ، لیکن دونوں میں قید و شرط لگی ہوئی ہے۔ یعنی ''چھوٹا پتھر'' اور ''گنجِ شائقاں''۔

رواں دواں ہے مدینے کو قافلہ میرا
ہے خاکِ راہ گزر عرش مرتبت میری

شعر میں مدینہ طیبہ کے دورانِ سفر اٹھنے والی خاکِ رہ گزر کو عرش مرتبت سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ دونوں مرکب ہیں۔ یعنی خاک اور عرش دونوں بالترتیب ''رہ گزر اور مرتبت'' سے کی قید سے مقیّد ہیں۔

جانِ قمر ہے، تابشِ رخسارِ مصطفیٰ
عنبر فشاں ہے، گیسوئے خمدارِ مصطفیٰ

## تشبیہ جمع :

تشبیہ جمع وہ تشبیہ ہے جس میں ایک چیز کو چند چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہو۔ یعنی مشبّہ ایک ہو اور مشبّہ بہٖ متعدد ہوں۔ مثلاً :

زندگانی جس کو کہتے ہیں، فراموشی ہے یہ
خواب ہے، غفلت ہے، سرمستی ہے، بیہوشی ہے یہ

اس میں زندگانی (مشبّہ) کو فراموشی، خواب، غفلت، سرمستی اور بیہوشی سے تشبیہ دی گئی جو کہ سب کے سب مشبّہ بہٖ ہیں۔ یعنی شعر میں مشبّہ ایک ہے اور مشبّہ بہٖ متعدد ہیں۔

(اردو میں علم بیان و بدیع کے مباحث: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص

:۵۲، پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

کلامِ نور میں تشبیہِ جمع کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ خاص طور سے جہاں تنسیق الصفات کی صنعت آئی ہے، وہاں تشبیہ جمع بھی موجود ہے۔

عالی خصال ، عمدہ سِیَر ، ارفع النظر
ماہِ صفات ، مہرِ فضائل ، کمال ور
اے یارِ غارِ مصطفیٰ ، صدّیق ِبا صفا
'' بعد از نبی بزرگ توئی قصہ مختصر''

اس قطعہ میں مشبہ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) ایک ہے اور مشبّہ بہ (عالی خصال، عمدہ سیر، ارفع النظر، ماہ صفات، مہر فضائل) متعدد ہیں۔

اخلاص ، کمال ، فضل ، دانش مندی
موصوف بہ ہر صفت ہیں شاہِ نوّاب

یہاں مشبّہ (شاعر کے ممدوح شاہ نواب علی) ایک ہے اور مشبّہ بہ یعنی اخلاص، کمال، فضل، دانش مندی متعدد ہیں۔

قلزمِ فضل و شرف ، مہرِ سپہرِ معرفت
صبر کے کوہِ گراں مخدوم صابر کلیری

اس شعر میں مشبّہ (مخدوم صابر کلیری) ایک ہے اور مشبہ بہ (قلزم، مہر، کوہِ گراں) متعدد ہیں۔

## تشبیہِ مطلق :

تشبیہِ مطلق، یہ کامل تشبیہ کی مثال ہے۔ تشبیہ مطلق اس کو کہتے ہیں جس میں تشبیہ کے سارے ارکان (مشبّہ، مشبّہ بہ، حرفِ تشبیہ اور وجہِ شبہ)

موجود ہوں۔ جیسے:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

اس شعر میں تشبیہ کے سارے ارکان (ہستی مشبّہ، حَباب مشبّہ بہ، کی سی حرفِ تشبیہ، وجہِ شبہ سراب جیسی فنائیت اور ناپائیداری) موجود ہیں۔
(اردو میں علم بیان و بدیع کے مباحث: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص: ۵۸، پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

**نمونۂ کلام:**

ملی جو خاکِ درِ مصطفیٰ خدا کی قسم
جبیں چمکنے لگی ماہِ پر ضیا کی طرح
خیال آیا جہاں دوریِ مدینہ کا
برس پڑیں مری آنکھیں وہیں گھٹا کی طرح

نور صاحب کے ان دونوں شعر میں تشبیہ کے سارے ارکان موجود ہیں۔

## تشبیہِ قریب:

تشبیہِ قریب ایسی تشبیہ ہے جس میں وجہِ شبہ آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ جیسے:

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو
کوئی آئینہ خانہ، کارخانہ ہے خدائی کا

شعر میں دنیا (خدائی کارخانہ) کو آئینہ خانہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہاں دنیا شیشہ مشبّہ اور آئینہ خانہ مشبّہ بہ ہے، جو آسانی سے سمجھ میں آ رہا ہے۔

کلامِ نور کے تشبیہاتی نظام میں تشبیہِ قریب کی رعنائیاں بھی موجود ہیں۔ موصوف کی شاعری چوں کہ ایک مقصدی شاعری ہے۔ ابلاغ و ترسیل ان کا بنیادی ہدف ہے۔ اس لیے وہ کلام میں ایسی تشبیہ لاتے ہیں جو متوسط ذہن رکھنے والے قاری و سامع کو بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔

جانِ قمر ہے ، تابشِ رخسارِ مصطفیٰ
عنبر فشاں ہے گیسوئے خمدارِ مصطفیٰ

جگہ جگہ پہ بچھے ہیں نبی کے دسترخوان
اڑا رہا ہے زمانہ یہ دعوتیں ان کی

گلاب روضہ آقا ، گہر در و دیوار
چمک دمک میں ہیں رشکِ قمر در و دیوار

مدینے کی گزر گاہیں تو دیکھو
سراسر نور کے فیتے کھُلے ہیں

مری نگاہ میں پیہم چمکتے رہتے ہیں
مثالِ ماہِ مبیں نقشِ پائے سرورِ دیں

پہلے شعر میں رخسارِ مصطفیٰ کو قمر اور آپ کے گیسوئے خمدار کو عنبر سے تشبیہ دی گئی ہے، جس کی وجہ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ دوسرے شعر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لطف و کرم اور سخاوت و فیاضی کو ''دسترخوان'' سے تشبیہ دی گئی ہے، جو بالکل آسان اور زود فہم ہے۔ تیسرے شعر میں روضہ مصطفیٰ کو گلاب، وہاں کے دیوار و در کو گُہر اور قمر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہاں وجہِ شبہ (لطافت و پاکیزگی، نورانیت) آسانی سے معلوم ہو جا رہی ہے۔ چوتھے شعر میں مدینہ منورہ کی گذر گاہوں کو ''نور کے فیتے'' سے اور پانچویں شعر میں حضور کے نقشِ پا کو ''ماہِ مبیں''

سے تشبیہ دی گئی ہے، وجہِ شبہ (چمک دمک) یہاں بھی ظاہر ہے۔

## تشبیہِ بعید:

کلام میں بعض تشبیہات ایسی ہوتی ہیں جن میں وجہ شبہ ذرا تامل اور غور وفکر کے بعد سمجھ میں آتی ہے۔ ایسی تشبیہات کو نادر، غریب یا بعید کہتے ہیں۔ جیسے:

ایک ناوک نے اس کی مژگاں کے
طائرِ سدرہ تک شکار کیا !!

اس شعر میں محبوب کی مژگاں کو ناوک سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ذرا غور وخوض کے بعد اس تشبیہ کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔
(اردو میں علم بیان وبدیع کے مباحث: تحقیقی وتنقیدی جائزہ ،ص:۵۴)

سید نور صاحب کے مندرجہ ذیل اشعار میں بڑی عمدہ تشبیہ موجود ہے، لیکن عام قاری کو وجہِ شبہ قدرے غور وخوض کے بعد سمجھ میں آتی ہے۔

دھوپ کے قافلے کرتے رہے پیچھا میرا
عشقِ سرکارِ دوعالم کے شجر ہونے تک

دل کے گلزار سے ہوگا نہ بہاروں کا گزر
عشقِ سرکار کا پیوست اگر تیر نہیں

تحفہ جس کا شہِ کونین کو بے حد ہے پسند
تیری آنکھوں کو میسر وہی جاگیر نہیں

## تشبیہِ مفصّل:

تشبیہِ مفصّل وہ تشبیہ ہے جس میں وجہِ شبہ بھی بیان کردی جائے۔

سر اٹھاتے ہی ہو گئے پامال
سبزۂ نَو دمیدہ کے مانند

اس شعر میں شاعر نے اپنی پامالی و بربادی کو سبزِ نو دمیدہ سے تشبیہ دے کر اس کی وجہِ شبہ پامالی کو واضح کر دیا ہے۔

(ایضاً،ص:۵۵)

مری نگاہ میں پیہم چمکتے رہتے ہیں
مثالِ ماہِ مبیں نقشِ پائے سرورِ دیں
گلاب روضۂ آقا ، گہر در و دیوار
چمک دمک میں ہیں رشکِ قمر در و دیوار
دل کی دنیائیں ہیں روشن جس کی آب وتاب سے
ہیں وہ خورشیدِ درخشاں مرشدی نوّاب شاہ

سید نور صاحب نے پہلے شعر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے اقدس کو ''ماہِ مبیں'' سے تشبیہ دے کر وجہِ شبہ ''(چمکتے رہتے ہیں) بھی بیان کر دی ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں روضۂ مصطفیٰ کے در و دیوار کو قمر سے تشبیہ دے کر اس کی وجہِ شبہ (چمک دمک) کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ تیسرے شعر میں اپنے ممدوح سرکار سیدی نوّاب علی شاہ کو ''خورشیدِ درخشاں'' سے تشبیہ دی ہے اور ساتھ میں وجہِ شبہ (آب وتاب) بھی بیان کر دی ہے۔

## اضافتِ تشبیہی :

تشبیہات کے لیے ضروری ہے کہ شاعر کی قوتِ متخیّلہ مضبوط ، مشاہدہ وسیع اور اس کو حقائقِ اشیاء کا علم خوب اچھی طرح حاصل ہو، تا کہ وہ

مختلف چیزوں میں سے صحیح اور درست وجہِ شبہ دریافت کر سکے۔ اردو شاعری میں ''اضافتِ تشبیہی'' کا استعمال عام ہے۔ مثلاً: مارِ زلف، کمان ابرو، گل رخسار۔ یہ تینوں اضافتِ تشبیہی کی مثالیں ہیں۔

**مارِ زلف :**

یعنی محبوب کی وہ زلف جو پیچ و تاب میں سانپ کے مانند بل کھاتی ہو۔

کمان ابرو: یعنی وہ ابرو جو ترچھے پن میں کمان کے مثل ہو۔

گل رخسار: یعنی وہ رخسار رنگ و نزاکت میں پھول کے مانند ہو۔

کلام میں جہاں اختصار و جامعیت ملحوظ ہوتی ہے، وہاں اضافتِ تشبیہی بہت کام دیتی ہے۔ اضافتِ تشبیہی میں مشبّہ بہ کو (جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے) پہلے لاتے ہیں اور مشبّہ بہ کو مشبّہ کی طرف مضاف کر دیتے ہیں۔ جیسے: گل رخسار۔ اس مثال میں گل مشبّہ بہ ہے اور رخسار مشبّہ۔

سید نور صاحب کے کلام میں اضافتِ تشبیہی کے نمونے بھی موجود ہیں۔

تازہ ہوا، مہکتی فضا، گل بکف دیار
آنکھوں نے دیکھا خلد کا منظر زمین پر

گل اور بھی ہیں گلشنِ کونین میں لیکن
کوئی بھی گلِ قدس نہ مہکا ترے آگے

آئنہ دل شہِ کونین پہ ہوتے ہیں نثار
روشنی منبعِ انوار سے جا ملتی ہے

اس مثال میں ''گل بکف دیار'' اور ''گلِ قدس'' اضافتِ تشبیہی کے قبیل سے ہیں۔

## کلامِ نور میں تشبیہات کی عمدگی :

کلامِ نور کا ایک ادبی حسن یہ بھی ہے کہ انہوں نے تشبیہات و استعارات کا مناسب اور برمحل استعمال کرنے کے ساتھ تشبیہ کو بڑی عمدگی کے ساتھ برتا ہے اور اسے الفاظ کا حریری پیرہن عطا کر کے جسمِ سخن کی تزئین و آرائش کا سامان مہیا کیا ہے۔ تشبیہ کی عمدگی سے متعلق چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

رشکِ صد لعل و جواہر اسے دنیا نے کہا
غمِ سرکار کچھ ایسا مرے دل پر اترا

سبحان اللہ! نبی کریم صلی اللہ علیہ کی یاد میں ملنے والے کو غم کو ''رشکِ صد لعل و جواہر'' سے تشبیہ دینا، کیا ہی عمدہ تشبیہ ہے۔ الفاظ و معانی کی اس لطیف صورت گری کا کام ایک قادر الکلام سخن ور ہی انجام دے سکتا ہے۔

چلے آؤ بس اک پل کو سرِ بالیں مرے آقا
تمہارا اک مریضِ غم چراغِ صبح گاہی ہے

یہ تشبیہ بھی اپنے اندر بڑی معنویت رکھتی ہے۔ اس شعر میں علمِ بیان کے دو اہم رکن یعنی تشبیہ اور استعارہ کا بیک وقت استعمال ہوا ہے۔ پہلے تو شاعر نے بطورِ استعارہ خود کو ''مریضِ غم'' سے تعبیر کیا ہے اور پھر اپنی اضطرابی کیفیت کو بتانے کے لئے خود کو ''چراغِ سحری'' سے تشبیہ دی ہے۔ تشبیہ کی عمدگی اور استعارہ کی جلوہ سامانی کے ساتھ شعر میں سوز و گداز کا عنصر بھی شامل ہے۔ گویا اس شعر میں ''شعریت و نشتریت'' کی صفت پائی جاتی ہے، جو جناب نور صاحب کی فکرِ رسا کا ایک اچھوتا نمونہ ہے۔

اللہ کے رسول جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کا کفِ پا (تلوہ شریف) بلاشبہ غیرتِ ماہ و نجوم ہے۔ چاند، سورج، ستاروں اور کہکشاؤں کی کیا مجال کہ کفِ پائے رسول کے حسن اور چمک دمک کے آگے اپنی تابانی دکھا سکیں۔ نعتیہ شاعری کا یہ ایک عام موضوع ہے، جسے بالعموم نعت گو شعراء نظم کرتے رہے ہیں۔ محض اس خیال کو شعر کے پیکر میں ڈھالنا کوئی کمال یا ہنر مندی نہیں۔ دقّتِ نظری اور کمالِ ہنر مندی تو یہ ہے کہ خاک کے جن ذرّوں نے آپ کے قدموں کو چوما اور جن خوش بخت غباروں کو آپ کے مبارک تلووں کے لمس کا شرف حاصل ہوا، ان کی قدر و قیمت متعین کی جائے اور انہیں ''رشکِ صد مہ و اختر'' کہا جائے۔ نور صاحب نے مندرجہ ذیل شعر میں بلیغ تشبیہ کے ذریعے اسی کمال و ہنر مندی کا مظاہرہ کیا ہے:

بوسہ ملا جسے کفِ پائے حضور کا
وہ ذرّہ رشکِ صد مہ و اختر بنا رہا

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک پسینے کی بوند سے ستاروں کے بننے اور وجود پانے کی تمثیل بھی عشاقِ پیمبر کے لئے باعثِ فرحت و مسرت ہے۔

بنتے رہے نجوم پسینے کی بوند سے
ان کے قدم بناتے ہوئے کہکشاں چلے

تشبیہات کی عمدگی اور استعارات کی نادرہ کاری کے ساتھ اگر طرزِ ادا کا بانکپن دیکھنا ہو تو عشق و عقیدت سے لبریز یہ اشعار بھی ملاحظہ کریں:

(۱) روشن ہیں چاند نعت کے میری زبان پر
پھر کیوں نہ تذکرے ہوں مرے آسمان پر

(۲) چٹک اٹھیں شاخِ دل کی کلیاں، مہکے اٹھے فکر کے دریچے
مرے خیالوں کی انجمن میں حضور جب آ کے مسکرائے

(۳) فلک نے آنچل میں ان کو اپنے سجا لیا جان کر ستارا
نبی کی یادوں کے چند موتی جو میری پلکوں پہ جھلملائے

(۴) اے ابرِ کرم ، شمعِ حرم ، جانِ دوعالم
سکّہ نہ چلا اور کسی کا ترے آگے

(۵) تمنا ہے کہ اک دن نعتِ آقا اس طرح لکھّوں
شعاعِ مہر ہو خامہ ، ورق ماہِ منور کا

(۶) نہ ہوتی گر در و دیوار پر جھالر درودوں کی
یہ دل ہرگز شہ ِ کونین کا حجرہ نہیں ہوتا

(۷) کس ماہتاب نے یہ بکھیری ہی چاندنی
انوار کا ہجوم ہے غارِ حرا کے پاس

(۸) ابنِ حیدر نے جو لکھّی ہے لہو سے اپنے
اس سے بہتر کوئی قرآن کی تفسیر نہیں

(۱) زبان پر مدحتِ مصطفیٰ اور ترانۂ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گونجنے کو یہ کہنا کہ
''روشن ہیں چاند نعت کے میری زبان پر'' تعبیر کی عمدگی کی ایک انوکھی مثال ہے۔

(۲) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بزمِ خیال میں تشریف لا کر مسکرانا اور پھر اس تبسّم کے سبب شاخِ دل کی کلیوں کا کِھلنا اور فکر کے دریچے کا مہکنا، ایک ایسی پر کیف تمثیل ہے، جس پر اردوئے معلیٰ جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں کو ''موتی'' سے تشبیہ دینا اور ان موتیوں کو ستارا سمجھ کر فلک کا اپنے آنچل میں باندھ کر رکھ لینا، معنیٰ آفرینی، زورِ بیان اور تشبیہ کی عمدگی کی بہترین مثال ہے۔

(۴) اس شعر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو استعارہ کے طور پر ''ابرکرم''، ''شمعِ حرم'' اور ''جانِ دو عالم'' کہا گیا ہے۔

(۵) شعاعِ مہر کو قلم بنا کر ماہِ منور کے ورق پر نعت پاک لکھنے کی آرزو بہت خوب ہے اور تشبیہ و تعبیر کی عمدگی کی دلیل ہے۔

(۶) دل کو شہنشاہ کونین علیہ الصلاۃ والتسلیم کے مبارک حجرے سے تشبیہ اور ''درودوں کی جھالر'' کی ترکیب، شاعر کی مہارتِ فن پر دلالت کرتی ہے۔

(۷) یہاں شاعر نے استعارتاً ''مہتاب'' سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد لی ہے اور غار حرا کے اردگرد انوار کے ہجوم کا سبب اسی مہتابِ عالم تاب کی ضیا باریوں کو بتایا ہے۔ یہ شعر بھی تشبیہ کی عمدگی کا ایک واضح ثبوت ہے۔

(۸) سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا اپنے خون سے حق وصداقت کی تاریخ لکھنے کو ''قرآن کی تفسیر بتانا'' بھی ایک اعلیٰ درجے کی تمثیل اور محبتِ اہلِ بیت کی منہ بولتی تصویر ہے۔

## استعارہ کی بحث :

استعارہ درحقیقت تشبیہ کی ایک مختصر صورت ہے۔ نظم ونثر میں تشبیہ و

استعارہ کے استعمال سے کلام کا حسن اور زور بڑھ جاتا ہے۔ مثلاً: اگر کسی بہادر آدمی کے بارے میں کہا جائے کہ ’’وہ بڑا بہادر ہے‘‘ تو یہ ایک معمولی اندازِ بیان ہوگا اور کلام میں کوئی حسن اور زور نہیں پایا جائے گا۔ اور اگر اسی بات کو یوں کہیں کہ ’’وہ شیر کے مثل ہے‘‘ تو یہ اب ’’تشبیہ‘‘ کہلائے گا اور اس سے کلام کا زور بڑھ جائے گا اور اگر کلمہ تشبیہ (مثل، طرح وغیرہ) حذف کر کے کہا جائے کہ ’’وہ شیر ہے‘‘ تو اس سے کلام کا زور اور زیادہ بڑھ جائے گا اور اب بھی اسے تشبیہ ہی کہیں گے۔ لیکن اگر مذکورہ بہادر شخص کا مطلق ذکر نہ کیا جائے اور یوں کہا جائے کہ ’’میں نے ایک شیر دیکھا‘‘ اور مراد وہی بہادر شخص ہو تو یہ ’’استعارہ ہے۔ کلام میں استعارہ کی ادائیگی کا ایک طریقہ اور بھی ہے کہ بہادر شخص کو شجاعت و بہادری میں شیر کے مثل ثابت کرنے کے لیے لفظِ شیر کا بھی ذکر نہ کیا جائے، بلکہ شیر کی کچھ خصوصیات اس شخص کے لیے استعمال کئے جائیں اور یوں کہا جائے کہ ’’جب وہ میدان جنگ میں دہاڑتا ہوا نکلا تو ہلچل مچ گئی‘‘۔ یہ اندازِ بیان پہلے سے زیادہ بلیغ، زوردار، طاقت ور اور لطیف ہے اور یہ بھی استعارہ ہے۔

## استعارہ کا لغوی واصطلاحی معنیٰ :

لغت میں ’’استعارہ‘‘ کا معنیٰ عارضی طور پر مانگ لینا، مستعار لینا، عاریتاً مانگنا یا اُدھار لینا ہے اور علم بیان کی اصطلاح میں ایک شے کو بعینہٖ دوسری شے قرار دے دینا اور اس دوسری شے کے لوازمات پہلی شے سے منسوب کر دینا، استعارہ کہلاتا ہے۔ استعارہ مجاز کی ایک قسم ہے، جس میں ایک لفظ کو معنوی مناسبت کی وجہ سے دوسرے کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی کسی لفظ کو اپنے

حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی میں استعمال کرنے کے لیے ادھار لے لینا۔
استعارہ میں حقیقی اور مجازی معنی میں تشبیہ کا تعلق پایا جاتا ہے، لیکن اس میں حرف تشبیہ موجود نہیں ہوتا۔ جیسے ''لبِ لعل'' اور ''سروقد'' یہاں لب کو لعل سے اور قد کو سرو سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اسی طرح چاند بول کر حسین چہرہ اور شیر بول کر بہادر آدمی مراد لینا، استعارہ ہے۔ تشبیہ اور استعارہ میں فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں ایک چیز کو دوسری چیز کے مثل یا مشابہ ٹھہرایا جاتا ہے، جب کہ استعارہ میں مبالغہ کے طور پر مجازاً ایک چیز کو بعینہ دوسری چیز تسلیم کرلیا جاتا ہے۔

آیت کریمہ: (**اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور**) اس فرمانِ الٰہی میں ظلمت سے مراد کفر و گمرہی اور نور سے ایمان و ہدایت مراد ہے اور یہ بطریقِ استعارہ ہے۔ ''زید شیر کی طرح ہے'' یہ تشبیہ ہے اور ''زید شیر ہے'' یہ استعارہ ہے۔ اسی طرح اگر ماں اپنے بچے کو یہ کہے کہ: ''میرا چاند آ گیا'' یا کوئی شخص یہ کہے کہ: ''خالد شیر ہے'' تو اس پہلے جملے میں بچے کو چاند سے اور دوسرے جملے میں خالد کو شیر سے تشبیہ دی گئی ہے، لیکن دونوں جملوں میں حرف تشبیہ موجود نہیں ہے۔ گویا یہاں چاند اور شیر کو حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ استعارہ کے طور پر مجازی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ تشبیہ کے اسی انداز کو استعارہ کہتے ہیں۔ تشبیہ میں مشبّہ اور مشبّہ بہ دونوں موجود ہوتے ہیں، جب کہ استعارہ میں مشبّہ بہ اور مشبّہ میں سے صرف ایک موجود ہوتا ہے۔ نیز استعارہ میں مشبّہ (مستعار لہ) کو عین مشبّہ بہ (مستعار منہ) تصور کرلیا جاتا ہے اور مشبّہ بہ کے تمام اوصاف مشبّہ کے ساتھ منسوب کر دیے جاتے ہیں۔

سجاد مرزا بیگ ''استعارہ'' کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ لفظ جو غیر وضعی معنوں میں استعمال ہو اور حقیقی و مجازی معنوں میں کے درمیان تشبیہ کا علاقہ ہو، نیز مشبّہ یا مشبّہ بہ کو حذف کر کے ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں لیکن کوئی ایسا قرینہ بھی ساتھ ہی ظاہر کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے کہ متکلم کی مراد حقیقی معنوں کی نہیں ہے۔معنیٔ مشبّہ کو ''مستعار لہ''، معنیٔ مشبّہ بہ کو ''مستعار منہ'' اور اس لفظ کو جو مشبّہ بہ کے معنیٰ پر دلالت کرے ''مستعار'' اور وجہِ شبہ کو ''وجہِ جامع'' کہتے ہیں۔

(تسہیل البلاغت، ص:۱۳۳، مطبوعہ: نظام دکن پریس، حیدر آباد)

**مثال :**

کعبے کے بدر الدجیٰ تم پہ کروڑوں درود
طیبہ کے شمس الضحیٰ تم پہ کروڑوں درود

اس شعر میں لفظ ''بدر الدجیٰ'' اور ''شمس الضحیٰ'' استعارہ ہیں، کیوں کہ یہاں اس کا استعمال حقیقی اور اصلی معنی میں نہیں ہوا ہے، بلکہ علاقہ تشبیہ کی بنیاد پر یہ معنیٔ غیر وضعی میں مستعمل ہے اور ان دونوں لفظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک مراد ہے۔

## استعارہ کی غرض و غایت :

عروسِ کلام کو زیورِ استعارہ سے مزین کرنے کا مقصد معنیٰ آفرینی، حسن آفرینی، اختصار، تشریح و وضاحت اور مضمون میں بلاغت پیدا کرنا ہے۔ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری استعارہ کی غرض و غایت سے متعلق لکھتے ہیں:

تشبیہات و استعارات کی بنیاد قیاس پر قائم ہے۔تشبیہ یا استعارہ

کا پہلا کام ''معنیٰ آفرینی'' ہے۔ کسی امر کو کتنا ہی واضح انداز میں بیان کیا جائے، ذہن مفہوم پانے سے قاصر رہتا ہے۔ لیکن ایک مقابل (تشبیہ و استعارہ پر مبنی) شعر فوراً مضمون کو آئینہ دار بنا دیتا ہے۔ تشبیہ یا استعارہ کا دوسرا کام ''حسن آفرینی'' ہے۔ تشبیہات اور استعارات تصویرِ نظم کے بوقلموں الوان (مختلف قسم کے رنگ) ہیں، جن کی آمیزش بغیر تصویر اکثر تکمیلِ حیات کو نہیں پہنچتی اور بے رنگ رہ جاتی ہے۔ تشبیہ یا استعارہ کا تیسرا کام اختصار اور بلاغت پیدا کرنا ہے۔ جو بات دو لفظوں میں ادا ہو جاتی ہے، دوسری طرف دو سطروں میں بیان نہیں ہو سکتی۔ (یعنی تشبیہ و استعارہ کی مدد سے کوئی بھی بات دو لفظوں میں بآسانی ادا ہو جاتی ہے، اس کے برعکس جو کلام تشبیہ و استعارہ پر مشتمل نہ ہو، اس کی وضاحت اور تشریح دو سطروں میں بھی بمشکل ہو پاتی ہے)

(محاسنِ کلامِ غالب، ص: ۱۵، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی)

استعارہ کی مدد سے کلام کے حسن و دلکشی میں اضافہ اور اختصار و جامعیت کے علاوہ کائنات کے بہت سارے غیر متبدل حقائق بڑی سہولت اور وضاحت سے بیان کر دیے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی فلسفیانہ شاعری میں اس جوہرِ کلام سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ استعاروں پر مشتمل یہ اشعار دیکھیں:

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں
پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی
باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلّی نہ بخارا

ان اشعار میں ''صحرا''، ''آہو''، ''بجلیاں''، ''برسے ہوئے بادل''، ''حسینوں''''حنا''، ''خونِ جگر''، ''سیلِ سبک سیر و زمیں گیر''، ''خس و خاشاک''، ''بیاباں''، اور ''دشت'' استعارات ہیں اور اقبال نے ان مستعار الفاظ کو حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال کر کے اپنی شعری مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

## استعارہ کی قسمیں :

### استعارہ تصریحیہ یا مصرّحہ :

استعارہ تصریحیہ وہ استعارہ ہے جس میں مشبّہ محذوف اور مشبّہ بہ مذکور ہو اور مشبّہ بہ سے مشبّہ مراد لیا جائے۔ مرزا غالب اپنے ایک خط میں نواب علاء الدین احمد خان کو لکھتے ہیں:

تم ثمرِ نو رس ( تازہ پھل پھول ) ہو اس نہال ( درخت ) کے جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے۔ یہاں نہال سے مراد نواب مذکور کے والد ہیں جن کو نہال سے تشبیہ دی ہے اور ان کا نام نہیں لیا ہے اور مشبّہ بہ نہال سے ان کو تعبیر کیا ہے۔

## استعارہ بالکنایہ :

استعارہ بالکنایہ وہ ہے جس میں مشبّہ بہ ترک کر دیا جائے اور مشبّہ مذکور ہو اور وہ شے جو کہ مشبّہ بہ سے تعلق رکھتی ہے، اس کو مشّبہ کے واسطے ثابت کریں۔

**مثال :**

ایک مدت تک تو ناسخ غم پہ غم کھایا کیا
آخر اک دن گور کے منہ کا نوالہ ہو گیا

یہاں ناسخ نے گور (قبر) کو حیوان کھانے والے سے تشبیہ دی ہے اور منہ اور نوالہ جو کہ حیوان کے لوازمات میں ہے، اس کو ذکر کیا ہے۔
(تسہیل البلاغت، ص: ۱۳۵، مطبوعہ نظام دکن پریس، حیدر آباد)

## تشریح و وضاحت :

استعارہ کبھی اس قسم کا ہوتا ہے کہ کلام میں مشبّہ بہ مذکور ہوتا ہے اور مشبّہ محذوف، اس کو استعارہ تصریحیہ یا مصرحہ کہتے ہیں۔ جیسے بہادر شخص کے بارے میں یہ کہنا کہ ''میں نے ایک شیر دیکھا''۔ یہاں مشبّہ بہ (شیر) کلام میں مذکور ہے اور مشبّہ (بہادر آدمی) کلام میں موجود نہیں۔ لہٰذا یہ ''استعارہ تصریحیہ'' ہوا۔

اور استعارہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں مشبّہ بہ مذکور نہیں ہوتا، لیکن مشبّہ بہ کے کچھ خصوصیات مذکور ہوتے ہیں۔ جیسے: ''وہ میدان جنگ میں دہاڑتا ہوا نکلا تو ہلچل مچ گئی''۔ یہاں مشبّہ بہ (شیر) کلام میں مذکور نہیں ہے، لیکن اس کے کچھ خصوصیات مثلاً دہاڑنا کلام میں موجود ہے۔ لہٰذا یہ ''استعارہ بالکنایہ'' ہوا۔ اس کو ''استعارہ مکنیّہ'' بھی کہتے ہیں۔ استعارہ کے تمام انواع

واقسام میں یہ سب سے زیادہ بلیغ مانا جاتا ہے۔

استعارہ تصریحیہ میں مشبّہ بہ کی صراحت ہوتی ہے اور مشبّہ محذوف ہوتا ہے۔ مثلاً: اولاد کے بارے میں میر انیس کہتے ہیں:

دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر
راحت کوئی آرامِ جگر سے نہیں بہتر
لذت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر
نکہت کوئی بوئے گلِ تر سے نہیں بہتر

مذکورہ اشعار میں ''آرامِ جگر''، ''پاکیزہ ثمر'' اور ''گلِ تر'' سے بطورِ استعارہ تصریحیہ اولاد اور فرزند مراد ہے۔

## کلامِ رضا سے استعارہ تصریحیہ کی مثال :

واللہ جو مل جائے مرے گل کا پسینہ
مانگے نہ کبھی عطر، نہ پھر چاہے دلہن پھول
کیا بات رضا اس چمنستانِ کرم کی
زہرا ہے کلی جس میں حسین اور حسن پھول

(امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ)

اس مثال میں ''گل'' سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ کی ذات پاک اور ''چمنستانِ کرم'' سے خانوادہ نبوّت مراد ہیں۔

### استعارہ بالکنایہ کی مثال :

سرِ فلک نہ کبھی تا بہ آسماں پہنچا
کہ ابتدا سے بلندی تھی انتہائے فلک

اس شعر میں استعارہ بالکنایہ کے طور پر ''فلک'' کو انسان سے تشبیہ دی گئی ہے اور مشبہ بہ یعنی انسان کو حذف کر کے اس کے جسمانی لوازمات میں سے ''سر'' کا ذکر کیا ہے۔

## مستعار کے اعتبار سے استعارہ کی تقسیم :

مستعار ( یعنی وہ لفظ جو استعارہ کے لیے استعمال کیا جائے ) کے اعتبار سے استعارہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) استعارہ اصلیہ (۲) استعارہ تبعیہ

**استعارہ اصلیہ** : استعارہ اصلیہ وہ ہے جس میں لفظِ مستعار اسمِ جنس یا مصدر ہو۔ مثلاً: بہادر آدمی کا استعارہ شیر سے جو کہ اسمِ جنس ہے اور'' ضربِ شدید''، یعنی سخت مار کا استعارہ قتل سے جو کہ مصدر ہے۔

**مثال :**

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے، چمن بیدا ہو جائے

یہاں چمن (لفظِ مستعار ) کا استعارہ غافل انسان سے ہے اور یہ اسمِ جنس ہے۔

**استعارہ تبعیہ** : استعارہ تبعیہ وہ ہے جس میں لفظِ مستعار فعل یا اسمِ فعل، مشتق یا حرف یا اسمِ مبہم ہو۔

**مثال :**

مسکراتی ہے جو رہ رہ کے گھٹا بجلی میں
آنکھ سی کوہ و بیاباں کی جھپک جاتی ہے

اس مثال میں ''مسکراتی ہے'' سے بطورِ استعارہ تبعیہ ''چمکتی ہے'' مراد ہے، اور یہ فعل ہے۔

بحرِ سائل کا ہوں سائل، نہ کوئیں کا پیاسا
خود بجھا جائے کلیجہ مرا چھینٹا تیرا

استعارہ تبعیہ بالعموم محاورہ (جو ہمیشہ اپنے معنیٰ حقیقی کے علاوہ معنیٰ مجازی میں مستعمل ہوتا ہے) کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ سجاد مرزا بیگ استعارہ تبعیہ کے ضمن میں اس کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

استعارہ تبعیہ وہ ہے کہ لفظ مستعار فعل یا مشتقاتِ فعل ہو۔ ایک مظلوم چلا رہا ہے: ''ہائے ظالم مارڈالا'' مطلب یہ ہے کہ ضربِ شدید پہنچائی۔ (مارڈالنا ایک محاورہ ہے جو ضربِ شدید کے معنیٰ پر دلالت کرتا ہے)

پیمانہ بن کے آتا کسی بادہ کش کے کام
انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

''مٹی خراب کی'' یہ استعارہ ہے بمعنیٰ ''ذلیل و رسوا کیا''۔ یہاں حقیقتاً تشبیہ و استعارہ دونوں مصدروں میں ہے۔ مارڈالنا یعنی ضربِ شدید پہنچانا اور مٹی خراب کرنا یعنی ذلیل و رسوا کرنا۔

(تسہیل البلاغت، ص: ۱۳۷)

## کلامِ نور کا استعاراتی نظام :

علمی و ادبی حلقے میں جناب سید نور الحسن صاحب ''شاعرِ جدّت طراز'' کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اور یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت بیانی ہے۔ موصوف کی شاعرانہ طبیعت میں جدّت و ندرت کوٹ کوٹ کر بھری

ہے۔ وہ عام خیال کو اپنے کیف آگیں اسلوب سے حسین اور پر کیف بنانے کے ہنر سے واقف ہیں۔ وہ پامال مضمون پر بھی اپنی منفرد طرزِ ادا سے نیا پن کا رنگ چڑھا دیتے ہیں۔ استعارہ چوں کہ ندرتِ اسلوب اور جدّتِ بیان کی جان ہے اور اس کے فنکارانہ استعمال سے حسنِ کلام میں چار چاند لگ جاتا ہے، اس لیے موصوف نے اپنے کلام میں اس محسّنہ شعری کا بڑے سلیقے سے جا بجا استعمال کیا ہے۔ ''کلامِ نور کا استعاراتی نظام'' بڑا وقیع اور فکر انگیز ہے، جس میں نفسِ استعارہ کا برمحل اور معنیٰ خیز استعال کے ساتھ اس کے متعدد اقسام مثلاً : استعارہ مصرحہ ،استعارہ بالکنایہ ،استعارہ اصلیہ، استعارہ تبعیہ ،استعارہ مطلقہ، استعارہ مرشّحہ اور استعارہ مجرّدہ کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ اشعار کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔

## کلامِ نور سے استعارہ تصریحیہ کے مثالیں :

سید نور صاحب کے کلام میں تشبیہ و استعارہ کی رعنائیاں قابلِ دید ہیں۔ تشبیہ کی طرح استعارہ اور اس کے انواع سے ان کی شاعری کا دامن مالا مال ہے۔ استعارہ مصرّحہ یا استعارہ تصریحیہ کے نمونے ملاحظہ فرمائیں۔ اشعار کے درمیان جن الفاظ کو واوین ('' '') کے درمیان گھیرا گیا ہے، وہ استعارہ تصریحیہ سے تعلق رکھنے والے الفاظ ہیں۔

جب وہ ''ماہِ عرب'' چمک اٹھّا
ہو گئے طور طور کے جلوے

ماہِ عرب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد ہے۔

چہرہ واالضحیٰ سے پھوٹی کرن
ہر طرف بکھرے نور کے جلوے

یہاں ''چہرۂ والضحیٰ'' سے روئے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا استعارہ کیا گیا ہے۔

چمکا رہی ہے آج بھی کل کائنات کو
اس '' نیّرِ کمال و فضیلت'' کی روشنی

''نیرِ کمال وفضیلت'' سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد ہے۔

کربلا کی ریت پر ایسا گلِ'' وانحر'' کھِلا
جس کے آگے ہر چمن زارِ رضا سجدے میں ہے

''گلِ وانحر'' سے سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔

اس گلشنِ حیات میں اے ''جانِ کائنات''
ایسی بہار آئے کہ جو بے خزاں رہے

یہاں ذات مصطفیٰ علیہ السلام کا استعارہ ''جانِ کائنات'' سے کیا گیا ہے۔

جس کی خاطر کیا سرکار نے سجدوں کو دراز
چرخِ عظمت کا نہ کیوں وہ ''مہِ تاباں'' ہوگا

''مہِ تاباں'' سے یہاں مراد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ہیں۔

میرا ''غم خانہ'' اندھیروں کا ہے مسکن یارب
'' مہرِ طیبہ'' کی ضیاؤں سے منور کردے

اس شعر میں دو استعارے موجود ہیں۔ نور صاحب نے یہاں ''غم

خانہ'' سے اپنے دل یا اپنے وجود کا استعارہ کیا ہے۔ اور ''مہرِ طیبہ'' سے ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا استعارہ کیا ہے۔

چہچہاتا رہے ہر وقت مرا'' طائرِ شوق''
یا خدا نعت کا وہ ذوقِ فراواں دے دے

''طائرِ شوق'' سے ''شاعر کا فکر و تخیّل'' مراد ہے۔

دل کی دنیائیں ہیں روشن جس کی آب و تاب سے
ہیں وہ'' خورشیدِ درخشاں'' مرشدی نوّاب شاہ

اس شعر میں ''خورشیدِ درخشاں'' سے شاعر کے ممدوح مراد ہیں۔

مائلِ لطف جو میرا'' مہِ کنعاں'' ہوگا
رشکِ صد مصر مرے دل کا بیاباں ہوگا

''مہِ کنعاں'' سے بطور استعارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد ہے۔

کس ''ماہتاب'' نے یہ بکھیری ہے چاندنی
انوار کا ہجوم ہے غارِ حرا کے پاس

''مہتاب'' سے مہتابِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کا استعارہ کیا گیا ہے۔ یعنی مہتاب سے یہاں حضور مراد ہیں۔

اے دردِ لا دوا تجھے شاید خبر نہیں
بیمار اب پہنچ گیا'' دار الشفاء'' کے پاس

یہاں'' دار الشفاء'' سے'' دربار رسالت'' یا پھر'' مدینہ منورہ'' کا استعارہ مقصود ہے۔

گل اور بھی ہیں گلشنِ کونین میں لیکن
کوئی بھی ''گلِ قدس'' نہ مہکا ترے آگے

''گل قدس'' سے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات طیبہ مراد ہے۔

جن کی آمد کی تھی منتظر بزمِ کن
مرحبا وہ'' گلِ خوش ادا'' آ گئے

''گلِ خوش'' سے حضور سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔

یہ ساری مثالیں استعارہ تصریحیہ یا استعارہ مصرّحہ کی ہیں۔ استعارہ تصریحیہ میں مشبّہ بہ مذکور ہوتا ہے اور مشبّہ محذوف اور مشبّہ بہ کو عین مشبّہ تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ اس میں چوں کہ مشبّہ بہ کی صراحت ہوتی ہے، اس لیے اسے استعارہ تصریحیہ یا استعارہ مصرّحہ کہتے ہیں۔

## کلام نور میں استعارہ اصلیہ کے نمونے :

استعارہ اصلیہ میں لفظِ مستعار اسمِ جنس یا مصدر ہوتا ہے۔ سید نور صاحب کے کلام کے استعاراتی گلشن میں استعارہ اصلیہ کے پھول بھی جا بجا کِھلے نظر آتے ہیں۔ مثلاً

گل اور بھی ہیں گلشنِ کونین میں لیکن
کوئی بھی گلِ قدس نہ مہکا ترے آگے

اس شعر میں دو استعارے ہیں۔ مصرعِ اولیٰ میں ''گل'' سے حضور کے علاوہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام مراد ہیں اور یہی (گل) لفظِ مستعار بھی ہے، جو کہ اسمِ جنس ہے اور مصرعِ ثانی میں ''گلِ قدس'' سے نبی کریم صلی اللہ علیہ کا استعارہ کیا گیا ہے۔ یہاں لفظِ مستعار گلِ قدس ہے اور اسمِ جنس ہے۔

کس ماہتاب نے یہ بکھیری ہے چاندنی
انوار کا ہجوم ہے غارِ حرا کے پاس

''ماہتابِ'' سے ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا استعارہ کیا گیا ہے۔ ماہتاب لفظِ مستعار اور اسمِ جنس ہے۔

جب وہ ماہِ عرب چمک اٹّھا
ہو گئے طور طور کے جلوے

یہاں ''ماہِ عرب'' سے مراد ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لفظِ مستعار ''ماہِ عرب'' ہے اور اسم جنس ہے۔

نوٹ: لفظِ مستعار (یعنی وہ لفظ جو استعارہ کے لیے استعمال کیا جائے) ہی اصل میں مستعار منہ ہوتا ہے اور مستعار منہ اصل میں مشبّہ بہ ہوا کرتا ہے۔

## استعاریہ تبعیہ :

کلامِ نور میں استعارہ تبعیہ کی کثیر مثالیں موجود ہیں۔ بالخصوص موصوف نے اپنے کلام میں جہاں جہاں اردو محاورات استعمال کیے ہیں، وہاں محاورہ کے ساتھ استعارہ تبعیہ بھی موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''استعارہ تبعیہ کہتے ہی اسے ہیں جس میں لفظِ مستعار فعل یا مشتقاتِ فعل ہو''۔ محاورہ میں لفظ اپنے حقیقی معنیٰ کے بجائے مجازی معنیٰ میں مستعمل ہوتا ہے اور استعارہ میں بھی یہی ہوتا ہے کہ لفظ کچھ اور ہوتا ہے اور اس کا معنیٰ کچھ اور لیا جاتا ہے۔ شیر بولا جاتا ہے اور بہادر آدمی مراد لیا جاتا ہے۔ نیز نظم و نثر میں محاورے کا استعمال مصدر کی شکل میں کم اور فعل و مشتقاتِ فعل کی صورت میں زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے محاورے کے ساتھ استعارہ تبعیہ عمومی طور پر پایا جاتا ہے۔ مثلاً:

''آج پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی''

''پھولے نہ سمانا'' ایک محاورہ جس کا معنیٰ ہے: حد سے زیادہ خوش ہونا۔ اسی طرح یہ استعارہ بھی ہے یعنی استعارہ تبعیہ۔ کیوں کہ یہاں'' پھولے نہ سمانے'' سے'' خوش ہونے'' کا استعارہ کیا گیا ہے اور اس میں چوں کہ لفظ مستعار ( پھولے نہ سمائیں گے ) فعل ہے، اس لیے یہ استعارہ تبعیہ ہوا۔

چہچہاتا رہے ہر وقت مرا طائرِ شوق
یا خدا نعت کا وہ ذوقِ فراواں دے دے

اس شعر میں'' طائرِ شوق'' سے مراد شاعر کا فکر و خیال یا جذبہ نعت گوئی ہے۔ (جیسا کہ دوسرے مصرعے سے ظاہر ہے ) یعنی طائرِ شوق سے فکر و خیال اور جذبہ شعر و سخن کا استعارہ کیا گیا ہے۔ نیز یہاں لفظِ مستعار'' طائرِ'' ہے جو کہ متعلقاتِ فعل میں سے ہے۔ لہٰذا یہ استعارہ تبعیہ ہوا۔

جنت نے بڑھ کے چوم لیے عاصیوں کے پاؤں
محشر میں مصطفیٰ کو طرف دار دیکھ کر

یہاں پاؤں چومنے سے تعظیم کرنے کا استعارہ کیا گیا ہے۔ لفظِ مستعار فعل ہے، اس لیے یہ استعارہ تبعیہ ہوا۔

ہو تنگ زمیں ہند کی کچھ غم نہیں مجھ کو
مل جائیں گے آقا کے غلاموں کو مکاں اور

'' زمین تنگ ہونا'' سے دشواریوں میں مبتلا ہونے کا استعارہ کیا گیا ہے۔ یہاں لفظ مستعار ( زمین تنگ ہونا ) فعل ہے۔ اس لیے یہ بھی استعارہ تبعیہ ہوا۔ اسی طرح مندرجہ ذیل شعر بھی استعارہ تبعیہ کے ضمن میں آتا ہے۔ کیوں کہ یہاں صل علیٰ کہنے سے'' واہ واہ کرنے یا سبحان اللہ کہنے'' کا استعارہ کیا

گیا ہے اور لفظ مستعار یہاں بھی فعل ہے۔

جب بھی ہونٹوں پہ مہکتا ہے گلِ نامِ نبی
آسمانوں کے مکیں صلِّ علیٰ کہتے ہیں

## استعارہ مطلقہ :

استعارہ مطلقہ، استعارہ کی وہ قسم ہے جس میں مستعارلہ (مشبّہ) اور مستعارمنہ (مشبّہ بہ) کے مناسبات وصفات کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ مثلاً:

یہاں اک شہر تھا'' شہرِ نگاراں''
نہ چھوڑا وقت نے اس کی نشانی

یہاں ایک شہر کو'' شہر نگاراں'' کہا گیا ہے اور دونوں میں سے کسی کے بھی مناسبات بیان نہیں کیے گئے ہیں۔

(اردو میں علم بیان و بدیع کے مباحث: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص:۶۲)

نور صاحب کے کلام میں استعارہ مطلقہ کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ یہ دو شعر دیکھیں:

جن کی آمد کی تھی منتظر بزمِ کن
مرحبا وہ '' گلِ خوش''ادا آ گئے

میرا ''غم خانہ'' اندھیروں کا ہے مسکن یارب
مہرِ طیبہ کی ضیاؤں سے منور کر دے

پہلے شعر میں '' گلِ خوش ادا'' سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کا استعارہ کیا گیا۔ گل خوش ادا مستعار منہ (مشبّہ بہ) اور ذاتِ حضور مستعار لہ (مشبّہ) ہے اوران دونوں میں سے کسی کے بھی مناسبات شعر میں

مذکور نہیں ہیں۔

دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں ''غم خانہ'' سے ''دل یا پورا وجود'' کا استعارہ کیا گیا ہے۔ غم خانہ مستعار منہ اور شاعر کا دل یا اس کا پورا وجود مستعار لہ ہے اور دونوں میں سے کسی کے بھی مناسبات شعر میں مذکور نہیں ہوئے ہیں۔

نوٹ : دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں مستعار منہ کے مناسبات کا ذکر ہے، لیکن یہ میرے استدلال سے خارج ہے۔

## استعارہ مجرّدہ :

استعارہ مجرّدہ وہ ہے جس میں مستعار لہ (مشبّہ ) کے مناسبات و صفات مذکور ہوں۔

اقرار ہے صاف آپ کے انکار سے ظاہر
ہے مستیِ شب نرگسِ میخوار سے ظاہر

یہاں محبوب کی آنکھ کو ''نرگس'' سے استعارہ کیا گیا ہے۔ اس میں آنکھ مستعار لہ ہے اور اس کے مناسبات ''مستی و میخواری'' کا ذکر موجود ہے۔ (ایضاً ص ٦٢)

نور صاحب کہتے ہیں:

سیراب کیا جاتا ہے پیاسوں کو بلا کر
میخانہ سرکار کا انداز جدا ہے !!

یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دریائے جود و سخاوت کو ''میخانہ'' سے استعارہ کیا گیا ہے۔ (یعنی میخانہ سرکار سے مراد سرکار کا دریائے جود و سخاوت ہے ) اس میں حضور کا دریائے جود و سخاوت ''مستعار لہ'' ہے اور اس

کے مناسبات میں سے ''سیراب اور پیاسا'' کا ذکر کیا گیا ہے۔

## استعارہ مرشّحہ :

استعارہ مرشّحہ، استعارہ کی وہ قسم ہے جس میں مستعار منہ (مشبّہ بہ) کے مناسبات مذکور ہوں۔ مثلاً:

فر یاد نہ کر نے پایا مضطر
تاباں ہوئی راکھ میں وہ اخگر

اس شعر میں بکاؤلی (شاعر کا ممدوح) کا استعارہ ''اخگر'' سے کیا گیا ہے۔ اخگر مستعار منہ (مشبّہ بہ) ہے اور اس کے مناسبات یعنی راکھ اور تاباں ہونا ذکر کیا گیا ہے۔

(ایضاً، ص:۶۲)

سرکار کی یاد آ رہی ہے !!!
پلکوں پہ چراغ جل رہے ہیں

سید نور صاحب نے اس شعر میں ''یادِ سرکار'' کا استعارہ ''چراغ'' سے کیا ہے۔ چراغ مستعار منہ (مشبّہ بہ) ہے اور اس کے مناسبات میں سے ''جل رہے ہیں'' کو ذکر کیا ہے۔ لہٰذا یہ استعارہ مرشّحہ ہوا۔

چمکا رہی ہے آج بھی کل کائنات کو
اس نیّرِ کمال و فضیلت کی روشنی

نور صاحب کے اس شعر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا استعارہ ''نیّرِ کمال'' سے کیا گیا ہے۔ نیّرِ کمال مستعار منہ (مشبّہ بہ) ہے اور اس کے مناسبات میں سے ''چمکا رہی ہے'' کا ذکر موجود ہے۔

چہرہ والضحیٰ کی کرنوں سے
ہو گئے طور طور کے جلوے

یہاں روئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا استعارہ ''چہرہ والضحیٰ'' سے کیا گیا ہے۔ چہرہ والضحیٰ مستعار منہ (مشبّہ بہ) ہے اور اس کے مناسبات میں سے ''کرن اور طور'' کا ذکر موجود ہے۔

نوٹ: راقم کی ناقص نگاہ سے کلامِ نور میں موجود ''استعارہ بالکنایہ'' تک نہیں پہنچ سکی، اس لیے اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

## مجازِ مرسل :

جب کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنوں کے علاوہ کسی دوسرے معنی میں استعمال کیا جائے اور اس کے حقیقی و مجازی معنی میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور تعلق ہو تو یہ ''مجازِ مرسل'' ہے۔ مجازِ مرسل میں کہیں کل بول کر جزء مراد لی جاتی ہے اور کہیں جزء بول کر کل مراد لیتے ہیں۔ کہیں مسبّب سے سبب مراد لیتے ہیں اور کہیں سبب سے مسبّب۔ کہیں ظرف سے مظروف مراد ہوتا ہے اور کہیں مظروف سے ظرف۔ مثلاً:

کبھی ہے نور کا طالب کبھی ہے ظلمت کا
کوئی بتائے کہ افتادِ آدمی کیا ہے؟

یہاں آدمی (جزء) بول کر تمام عالم کے لوگ (کل) مراد لی گئی ہے۔

(تفہیم البلاغت، ص: ۲۰، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

روزمرّہ زندگی میں لوگ عام طور پر باہمی گفتگو اور آپسی بول چال کے دوران مجاز مرسل کا استعمال کرتے ہیں، لیکن اس کی حقیقت کی طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا ہے۔ ہم بولتے ہیں کہ: ''دنیا بڑی بیوفا ہے''۔

یہاں دنیا سے اہلِ دنیا یعنی ظرف سے مظروف مراد ہے۔ اسی طرح ہم بولتے ہیں: ''مشرق ومغرب کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے''۔ ظاہر سی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف مشرق ومغرب کا ہی مالک نہیں، بلکہ شمال وجنوب سمیت کل کائنات کا مالک ہے۔ مشرق ومغرب پوری کائنات کے دو جزء اور دو حصے ہیں۔ اس جملے میں جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے۔

یہ جملہ بھی عموماً بولا جاتا ہے: ''بجلی کی کڑک اور اس کی گرج دار آواز سن کر میں نے کان میں انگلی ڈال دی''۔ کوئی بھی شخص اپنے کان میں پوری انگلی نہیں ڈالتا، بلکہ انگلی کا ایک جز ''پورا'' ڈالتا ہے۔ یہاں کل بول کر جزء مراد لیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہم بولتے ہیں: ''طبیب نے میری نبض پر ہاتھ رکھی''۔ طبیب نبض پر پورا ہاتھ نہیں رکھتا، بلکہ ہاتھ کا ایک جزء انگلیاں رکھتا ہے۔

سید نور صاحب کے کلام میں مجازِ مرسل کی خوبیاں بھی قارئین کے دامانِ دل کو اپنی جانب کھینچتی ہیں۔ چند مثال پیشِ خدمت ہے:

صحنِ گلزارِ نفَس تیری نمو سے تازہ
کوچہ فکر وتخیّل میں ہے نزہت تیری

یہاں جزء بول کر کل مراد لیا گیا ہے، جس پر قرینہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی نمو سے صرف گلزارِ نفس کے صحن اور کوچہ فکر وتخیل میں ہی نمو اور تازگی نہیں رہتی، بلکہ پورے وجود میں اس کی رحمت کی نمو، تازگی اور

خوشبو شامل ہے۔

جو اسمِ گرامی لکھا جائے ان کا
تو سجدے میں نوکِ قلم دیکھتے ہیں

لکھتے وقت صرف قلم کی نوک ہی نہیں جھکتی، بلکہ پورا قلم جھک جاتا ہے، گویا سجدے میں چلا جاتا ہے۔ یہاں بھی جزء سے کل مراد ہے۔

لہو تازہ ٹپکتا ہے ابھی تک زخمِ باطل سے
یہی تو کاٹ ہے صبر و رضا کے تیز خنجر کی

یہاں باطل سے اہلِ باطل مراد ہے۔ یعنی مظروف سے ظرف مراد ہے۔

آپ کے سامنے شرمندہ نہ ہم ہوں آقا
کاش ایسا ملے ہم کو سرِ محشر کاغذ

کاغذ سے مراد نامہ اعمال ہے۔ یہاں شاعر نے ظرف بول کر مظروف مراد لیا ہے۔

پوچھو ابلیس سے گستاخِ نبوت کی سزا
کس بلندی پہ تھا اور کس طرح مسقوط ہوا

اس شعر میں مصدر (نبوت) سے اسم فاعل (نبی) مراد ہے اور یہ بھی مجاز مرسل کی ایک صورت ہے۔

☆☆☆

## کلامِ نور میں لطافتِ خیال کا پہلو:

شعر کی معنوی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے کہ شعر میں پیش کیا گیا خیال، بلند، لطیف اور پاکیزہ ہو۔اسی کو ''لطافتِ خیال'' کہتے ہیں۔خیال کی بلندی سے مراد یہ نہیں ہے کہ کوئی ایسی عجیب اورانوکھی بات کہی جائے جو معمولی سمجھ سے بالاتر ہو، بلکہ خیال رکیک اور عامیانہ نہ ہو، شریفانہ ہو اور جو جذبہ اس خیال میں شامل ہے، اس میں انسانیت اور تہذیب وشرافت کا عنصر نمایاں ہو۔''لطافتِ خیال'' کے ضمن میں ''خیال کی باریکی'' بھی شامل ہے،جس کا مطلب یہ ہے کہ خیال سطحی نہ ہو بلکہ انسانی فطرت کے گہرے مطالعے اور کائنات کے وسیع مشاہدے کا نتیجہ ہو۔عام فہم بات اور سیدھے سے خیال کو پُر پیچ بنا کر پیش کرنا ،شعر میں کوئی دور از کار استعارہ یا استعارہ در استعارہ استعمال کرنا ،خلافِ قیاس مبالغے سے کام لینا ، یہ خیال کی باریکی نہیں بلکہ طرزِ ادا کی پیچیدگی ہے، جو شعر کا حسن نہیں،عیب ہے۔

جناب سید نورالحسن کی نعتیہ شاعری کا ایک نمایاں پہلو طہارتِ فکر اور لطافتِ خیال ہے۔جذبات کی پاکیزگی،خیالات کی بلندی وباریکی، بیان کی سچائی،اوراسلوبیاتی عمل کی طرفگی نے ان کے کلام میں سحر انگیزی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ وہ ہمیشہ بلند اور لطیف خیالات واحساسات کی مصوّری کرتے ہیں،جن سے کلام کی چاشنی میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔مندرجہ ذیل اشعار میں فکرِ نور کی لطافت ملاحظہ کریں:

صحنِ گلزارِ نفس تیری نمو سے تازہ
کوچہ فکر و تخیل میں ہے نزہت تیری
نعتِ نبی کے پھول وہ مہکے ہیں ذہن میں
خوشبو سے میری فکر کا دامن بھرا رہا
آسیب آ رہے ہیں تو آنے دو سامنے
نامِ نبی کا تیر چڑھا ہے کمان پر
دل میں کِھلا کے عشقِ نبی کے حسیں گلاب
باغِ جناں کی سیر و سیاحت کریں گے ہم
نکہتِ مشکِ ختن بھی ہم کو راس آتی نہیں
ہے مشامِ جاں میں خوشبو گیسوئے سرکار کی
مہر و مہ نے نور سے کشکول اپنا بھر لیا
جب بٹی خیرات تیرے چہرہ ضوبار کی
مرے یقیں کے چمکتے کاغذ پہ کوئی تحریر کر گیا ہے
بلائیں گے نورؔ تم کو آقا قریب وہ دن بھی آ رہے ہیں
دارائی اس کے در پہ کھڑی ہے بصد نیاز
اس در کے خوشہ چینوں میں جس کا شمار ہے
کس ماہتاب نے یہ بکھیری ہے چاندنی
انوار کا ہجوم ہے غارِ حرا کے پاس
نہ ہوتی گر در و دیوار پہ جھالر درودوں کی
یہ دل ہر گز شہِ کونین کا حجرہ نہیں ہوتا

☆☆☆

## حسنِ ترکیب وخوبیِ استعارہ :

سید فضل الحسن حسرت موہانی ''حسنِ ترکیب، خوبیِ استعارہ ولطفِ تشبیہ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

تازگیِ کلام وندرتِ مضمون کے مانند حسنِ ترکیب، خوبیِ استعارہ اور لطفِ تشبیہ کو بھی پیشہ گاہِ سخن میں بہت بڑا درجہ حاصل ہے۔ اشعار میں یہ تینوں خوبیاں اس قدر متصل اور اکثر اس طرح دست وگریباں پائی جاتی ہیں کہ انہیں علاحدہ علاحدہ پیش کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

(محاسنِ سخن، ص: ۳۵، مطبوعہ: رئیس المطابع، کان پور)

اشعار کے سادہ خاکوں میں حسنِ ترکیب اور لطفِ استعارہ کا رنگ بھرنا، بڑا دقت طلب امر ہے۔ اس کے لیے شاعرانہ فطری لیاقت اور شعری ہنرمندی کے ساتھ محنت اور سخت ریاضت کی ضرورت ہے۔ زیادتی ہر چیز کی بری ہوتی ہے۔ کوئی تصویر اسی وقت پر فریب اور جاذبِ نظر کہلاتی ہے، جب اس میں اعتدال وتوازن کے ساتھ رنگ بھرا جائے۔ تصویر میں جو رنگ ہو، وہ نہ بہت گہرا اور شوخ ہو اور نہ بالکل پھیکا اور پژمردہ، بلکہ ایک خفیف تموّج اور تدریجی تغیر کے ساتھ شوخی و لطافت کی اس طرح آمیزش ہو کہ دونوں کے درمیان اعتدال وتوازن برقرار رہے۔

اصغر نشاطِ روح کا اک کھِل گیا چمن
جنبش ہوئی جو خامہ رنگیں نگار کو

(اصغر گونڈوی)

جناب سید نور صاحب کے کلام میں دیگر ادبی محاسن کے علاوہ جو چیز

کثرت سے نظر آتی ہے، وہ یہی حسنِ ترکیب ،لطفِ تشبیہ اور خوبیِ استعارہ ہے۔شاید ہی ان کا کوئی کلام ایسا ہوگا جس میں یہ ادبی اوصاف نہ ہوں۔ موصوف نے اپنی نعتیہ شاعری میں ان تینوں اسلوبِ بیان کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ان شعری محاسن کو دیکھ کر اصغر گونڈوی کا مذکورہ بالا شعر فکر و خیال میں گردش کرنے لگتا ہے۔ بلا مبالغہ انہوں نے اپنے خامہ رنگیں نگار کو جنبش دے کر شعر و سخن کے صحرا میں نشاطِ روح کا ایک چمن آباد کیا ہے،جس کے نوع بنوع پھول سے آنے والی نسلیں اپنے مشامِ جاں معطر کرتی رہیں گی۔ان کی نعتیہ شاعری صرف عقیدت و محبت اور عشقِ رسالت کا مرقع ہی نہیں ، بلکہ زبان و ادب کی آئینہ دار بھی ہے اور یہ صرف میرا ہی خیال نہیں ، بلکہ جناب نور کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لینے والے درجنوں افاضلِ ادب اور ماہرینِ سخن اس معاملے میں راقم کے ہم نوا ہیں۔

عصر حاضر کے ممتاز محقق و ناقد ڈاکٹر سید شمیم گوہر لکھتے ہیں:

جو شاعری ( صنف نعت پاک ) ہمارے ایمان کی علامت ہو، عشقِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا وظیفہ پڑھتی ہو، اسلامی آداب و تہذیب کی دولت تقسیم کرتی ہو، حصول ثواب اور جزائے خیر کا دم بھرتی ہو، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ایک دیوانہ رسول کے سوا اور کون لگا سکتا ہے۔ انہیں لطیف جذبات کی وادیوں سے گذرنے والوں ، ہوش و جوش کی بے لوث خوشبو بکھیرنے والوں ، دل کی امنگوں کو پائے ناز پر نچھاور کرنے والوں ، آنسوؤں کی سوغات درِ اقدس پر قربان کرنے والوں اور جمال و کمال پر دین و ایمان فدا کرنے والوں میں عاشقِ رسول ، مداح نبی ، قادر الکلام شاعر جناب سید محمد نور الحسن نور فتح پوری بھی شامل ہیں۔جنہوں نے

گیسوئے نعت اور گلشن مدح وثنا سنوار نے میں زبان و بیان اور طبع آزمائی کا بیش بہا اثاثہ نثار کیا ہے۔فنی لطافتوں کے آئینے میں اعلیٰ قدروں کی تجلیوں نے موصوف کی شاعری کی خوب پذیرائی کی ہے۔ان کے جذبہ طاہر نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر سینے میں گلہائے عقیدت کی مہک موجود ہو اور مہارت زبان و بیان کی روشنی بھی ہو تو نعت کے بیشتر اشعار فکر وفن کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔

(مرکزِ نور؛ص:۸، دبستان نوابیہ عزیزیہ، قاضی پور شریف)

## نمونہ کلام :

جل رہا ہے طاقِ لب پر اسمِ احمد کا چراغ
اے مری سانسو! سنبھل کر با ادب با احتیاط
ہر ایک قطرے میں جس کے ہو عشقِ شاہِ امم
چھپا ہو کاش سمندر وہ دیدہ تر میں
خوشبو کے قافلے ہوئے رقصاں سرِ چمن
بادِ صبا نے چھیڑا جو نغمہ حضور کا
باغِ عظمت ہے ترا، برگ وثمر تیرے ہیں
شاخِ توقیر کا ہر ایک گلِ تر تیرا
لطفِ شہِ کونین کا نم ہو گیا حاصل
گلزار بکف آج مرا دشتِ نوا ہے
نعت پڑھتی ہے تری بادِ صبا کی مستی
لبِ امواج پہ ہے ذکر برابر تیرا

جہاں پہ ملتا ہے ''اقرا'' کا پر فضا موسم
وہیں سے وادیِ ''غارِ حرا'' نکلتی ہے

لباسِ عشقِ سرور زیب تن کر لے تو اچھا ہے
کوئی صورت نہیں ورنہ خدا کو منہ دکھانے کی

یارب شرابِ عشقِ نبی اس میں ڈال دے
روزِ ازل سے دل مرا خالی گلاس ہے

ذرّۂ خاکِ مدینہ نہیں حاصل اے نور
اس لئے آئنہ آمادۂ تنویر نہیں

میں ہوں اک ذرّہ دربارِ شہِ کون و مکاں
اخذ کرتی ہے نمو موجِ بَہاراں مجھ سے

## سلاست وروانی، صفائی وبرجستگی :

شعروادب میں سلاست وروانی کی مثال بہتے ہوئے چشموں اور گرتے ہوئے آبشاروں سے دی جاتی ہے۔ جس طرح جھرنے اور آبشار اپنے اپنے دھن میں بہے جاتے ہیں اوراس کے گرنے کی آواز کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے، ایسے ہی کلام میں سلاست وروانی کا حسن قارئین و سامعین پر خوش گوار اثر مرتب کرتی ہے۔ سلاست وروانی کو'' بندش کی صفائی''، ''نشست کی خوبی'' ترکیب کی دل آویزی'' اور'' برجستگی'' کا نام بھی دیا ہے۔

چناں چہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

جب کسی مصرع یا شعر کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا تناسب،

توازن اور توافق پایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود فصیح بھی ہوتے ہیں تو وہ پورا مصرع یا شعر ''فصیح'' ہو جاتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کو بندش کی صفائی، نشست کی خوبی، ترکیب کی دل آویزی، برجستگی اور سلاست و روانی سے تعبیر کرتے ہیں۔

(موازنہ انیس و دبیر، ص: ۴۰، لالہ رام نرائن لعل، الٰہ آباد)

شبلی نعمانی کے مندرجہ بالا اقتباس سے ''سلاست و روانی'' کا مفہوم کما حقہ واضح نہ ہو سکا۔ علامہ سید سلیمان اشرف بہاری اپنی شہکار تصنیف ''مقدّمہ مثنوی ہشت بہشت'' میں سلاست و روانی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

سلاست کے یہ معنیٰ ہیں کہ الفاظ وہ ہوں جو روزمرّہ کے استعمال میں ہوں۔ محاورہ وہ ہو جو عام طور پر زبانوں پر جاری ہو۔ استعارہ و تشبیہ ایسے ہوں کہ سامع کا ذہن فوراً اس کی طرف منتقل ہو جائے۔ اضافت کی کثرت و پیچیدگی نہ ہو۔ ادنیٰ، اوسط، اعلیٰ ہر شخص اپنے فہم و مرتبہ کے مطابق برابر کا لطف اٹھائے۔

(**الانھـــار**۔۔ مقدمہ مثنوی ہشت بہشت، ص: ۸، نوریہ رضویہ پبلشنگ کمپنی، لاہور)

سلاست و روانی اور صفائی و برجستگی میں مندرجہ ذیل اشعار اپنا جواب نہیں رکھتے:

تعریف میں چشمہ کو سمندر سے ملا دوں !!
قطرہ کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرّے کی چمک مہرِ منور سے ملا دوں !!!
کانٹوں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں

گلدستہ معنیٰ کو نئے ڈھنگ سے باندھوں !!
اک پھول کا مضموں ہوتو سو رنگ سے باندھوں

(میر انیس لکھنوی)

موجِ نسیمِ صبح کے قربان جایئے
آئی ہے بوئے زلفِ معنبر لئے ہوئے
پہلی نظر بھی آپ کی اف کس بلا کی تھی
ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پر لئے ہوئے

(اصغر گونڈوی)

سلاست و روانی اور صفائی و برجستگی کی مندرجہ بالا تعریف سامنے رکھ کر نیچے دیے گئے اشعارِ نور کا مطالعہ کریں۔ آپ کو نہ کوئی لفظ غیر مانوس ملے گا، نہ کوئی ترکیب اور اضافت پیچیدہ ملے گی۔ بلکہ اس کے برعکس مانوس الفاظ وتراکیب، قریب الفہم تشبیہ، آسان محاورے اور آبشاروں کی مانند بل کھاتے شعری اسلوب اس بات کا ثبوت فراہم کریں گے کہ سلاست و روانی اور صفائی و برجستگی میں کلامِ نور لاجواب و بے مثال ہے۔ سلامت و برجستگی، صفائیِ بیان اور شگفتگی و روانی کے جوہر سے ان کا ہر ایک کلام مالا مال ہے۔

مرزا غالب کی زمین میں کہی گئی موصوف کی یہ نعت سلاست و روانی اور صفائی و برجستگی کا چمکتا آئینہ ہے:

جو درِ نبی پہ جانا مرا ایک بار ہوتا
تو قسم خدا کی گلشن مرا پر بہار ہوتا

کوئی آنکھ جگمگاتی ، کوئی آنکھ خواب بُنتی
کوئی طیبہ جاتا ہوتا ، کوئی بیقرار ہوتا
جو فراقِ مصطفیٰ میں مری آنکھ سے نکلتے
مرے بہتے آنسوؤں پر مہِ نَو نثار ہوتا
شبِ خواب وعدہ ہوتا جو حضور کے کرم کا
درِ آرزو پہ روشن گلِ انتظار ہوتا
تری نعت کے دِیئے بھی جو بکھیرتے اجالے
تو یہ آگہی کا منظر بڑا خوش گوار ہوتا
ترے دامنِ کرم میں وہ دوام ہوتا حاصل
'' نہ کبھی جنازہ اٹھتا ، نہ کہیں مزار ہوتا''
تجھے اے گلِ بَہاراں نہ خزاں کے ہاتھ پاتے
شہِ دوجہاں کی مدحت جو ترا شعار ہوتا
مرے مصطفیٰ یہ کہہ کر ترا نور رو رہا تھا
تری خاک پا جو پاتا تو میں تاج دار ہوتا
(ثنا کی نکہتیں۔مجموعہ نعت برزمین غالب،ص:۶۰-۶۱)

کہنی ہے مجھے نعتِ شہِ کون و مکاں اور
اللہ عطا کر کوئی اندازِ بیاں اور
میں جھوم کے جس وقت پڑھوں نعت کے اشعار
ہر سمت سے آنے لگیں آوازیں کہ ہاں اور
اوڑھی ہے میری فکرِ سخن نے ردائے نعت
اب تو مرے لیے ہے یقینی عطائے نعت

بادِ سبک خرام کی لے پر پرندِ شوق
شاخِ نوا پہ بیٹھا ہوا گنگنائے نعت
شکرِ خدا کہ دستِ خیالِ رسولِ پاک
تھامے ہے میرے خیمہ ادراک کی طناب

☆☆☆

بغیر عشقِ نبی ''نعت'' ہو نہیں سکتی
قصیدہ ہوگا ، غزل ہوگی ، مرثیہ ہوگا
لوحِ ایجادات پر جب ارتقا لکھا گیا
نامِ نامی سرورِ کونین کا لکھا گیا
سامنے رکھ لے چراغِ صبح و شامِ مصطفیٰ
چہرۂ کردار تیرا ضوفشاں ہو جائے گا
جھک گیا میرا قلم نعت نگاری کے لئے
ورنہ آسان نہ تھا اتنا نمایاں ہونا

☆☆☆

## ندرتِ ادا یا اسلوبِ بیان کی جدّت :

### اسلوب کیا ہے؟

اسلوب یا اسلوبِ بیان کی اصطلاح اور استعمال عام ہے۔ تحریر و تقریر کی سحر انگیزی واثر آفرینی میں اسلوب بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے۔ معمولی خیال اور سطحی مضمون بھی اسلوب کی جدّت اور پیرایۂ بیان کی ندرت سے وقیع، معنیٰ خیز اور معیاری بن جاتا ہے۔ اس لیے اسلوبِ بیان کے اچھوتے

پن کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔

اسلوب کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے پروفیسر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

اسلوب، افکار و خیالات کے اظہار و ابلاغ کا ایسا پیرایہ ہے جو دل نشیں بھی ہو اور منفرد بھی۔ اسی کو انگریزی میں ''Style'' کہتے ہیں اردو میں اس کے لیے'' طرز یا اسلوب'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی اور جدید فارسی میں اسی کو'' سبک'' کہتے ہیں۔ ان الفاظ کے اصل پر ہی غور کرنے سے ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلوب میں ترصیع یا صنّاعی (Ornamention) کا مفہوم شامل ہے۔

(اسلوب کیا ہے، ص:۱۲، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ)

طرزِ نگارش یا اسلوب بیان، فن اور شخصیت کے اظہار کا وہ مابہ الامتیاز وصف ہے، جس سے مصنف یا شاعر کے بلند فکر و خیال اور ذوق و جدان کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بوفان کا قول ہے:'' اسلوب خود انسان ہے''۔ یعنی اسلوب کے ذریعے مصنف یا شاعر کی شخصیت اپنے تمام نشیب و فراز کے ساتھ الفاظ میں منتقل ہوجاتی ہے۔ اسلوب ہی وہ واحد معیار ہے جس کے سبب مصنف یا ادیب و شاعر کے بارے میں دوٹوک فیصلہ کیا جاتا ہے کہ'' وہ صاحبِ طرز ادیب و شاعر ہے یا نہیں؟''۔ آج ہر کس و ناکس اور معمولی لکھاڑی کو'' صاحبِ طرز ادیب'' کہہ دیا جاتا ہے، جو کہ غلط اور ایک ادبی گناہ ہے۔

ابلاغ و ترسیل اور پیرایۂ بیان کے لحاظ سے عام طور پر چار اسالیبِ بیان اردو میں رائج رہے ہیں۔

(۱) سادہ اسلوب (۲) تمثیلی اسلوب (۳) مقفّٰی اسلوب

(۴) داستانی اسلوب

شاعری میں بالعموم سادہ اور تمثیلی اسلوب رائج ہیں۔ جب کہ نثر میں سادہ، تمثیلی، مقفّیٰ، اور داستانی چاروں اسالیبِ بیان مروّج و مستعمل ہیں۔

معنیٰ آفرینی اور لطافتِ خیال کے ساتھ ایک کامل الفن شاعر کے لئے ندرتِ ادا یا اسلوبِ بیان کی جدّت بھی بڑی اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہے۔ اس کے بغیر تمام معنیٰ آفرینیاں اور جدّت طرازیاں بیکار ہیں۔ اس لئے جو شعراء بلاغت آشنا ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ ایسا دل آویز پیرایۂ بیان ادا کرتے ہیں، جسے دیکھ کر اور سن کر قاری و سامع عش عش کر اٹھتے ہیں اور معمولی خیال بھی پیکرِ جمال کا روپ دھار لیتا ہے۔ ندرت ادا کا اندازہ اصغر گونڈوی کے ان اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

مری نگاہوں نے جھک جھک کے کردیے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا !!!
پرتوِ رخ کے کرشمے تھے سرِ راہ گذر !!
ذرّے جو خاک سے اٹھے وہ صنم خانہ بنے

(اصغر گونڈوی)

سید نور صاحب اسلوبِ بیان کی حقیقت و اہمیت اور شعری تاثیر کے اس لطیف رمز سے واقف ہیں، اس لیے وہ ہمیشہ ندرتِ ادا اور اسلوبِ بیان کی جدّت کا خاص خیال رکھتے ہیں اور اپنی مہارتِ فن کا ثبوت دیتے ہوئے شعر کے سادہ خاکوں میں جدّتِ اسلوب اور رنگینیِ بیان کا رنگ بھرتے ہیں، جس سے قارئین مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ سچ پوچھئے تو اسلوبِ بیان کی جدت ہی انہیں ہم عصر نعت گو شعراء سے منفرد و ممتاز کرتی

ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں سادہ اسلوبِ بیان ہے، وہاں جدّت و ندرت کے نمونے تو کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن ''تمثیلی اسلوب'' میں ایک مصوّر کی طرح وہ اپنا کمال دکھاتے ہیں اور اسلوب کی جدّت و ندرت کے نئے نئے پیکر تراشتے ہیں۔ ہم یہاں ان کے دونوں اسلوبِ بیان کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

## سادہ اسلوب کی مثال :

ہر طرف سے یہی صدا آئے
مصطفیٰ آئے ، مصطفیٰ آئے
رحمتِ کائنات سب کے لیے
رحمتوں کی لئے ردا آئے
فردوس کا نمونہ بہر اعتبار ہے
سرکار کا مدینہ بڑا شان دار ہے
جو صاحبِ لولاک کی عظمت کا ہے منکر
اے نور مجھے اس سے سروکار نہیں ہے
طیبہ کی طرف جو چل پڑا ہے
منزل کا اسے پتہ ملا ہے !!
ہر لفظ ، ہر ایک حرف اے نور
سرکار کی '' نعت '' پڑھ رہا ہے
آرزو ہے کہ جاؤں جنّت میں
لکھ دے یارب مدینہ قسمت میں

جتنے گل ہیں نبی کے گلشن کے
سب نمایاں ہیں رنگ و نکہت میں
یادِ طیبہ ستا رہی ہے مجھے
کیا سکوں بخش بے قراری ہے
مسکراتی ہے ان کی چشمِ کرم
آبشارِ خیال جاری ہے !!!
ہر شجر پر کھِلے ہیں نعت کے پھول
یادِ آقا کی تخم کاری ہے
میرے آقا کی ہے دعا شامل
یوں ہری فصلِ انکساری ہے

☆☆☆

مندرجہ بالا مثال میں پہلے کے ساتوں اشعار محض ''اسلوبِ بیان'' کے نمونے ہیں۔ان میں جدّت ادا یا ندرتِ اسلوب کا وصف نہیں پایا جاتا۔ جب کہ آخر الذکر پانچوں اشعار سادہ اسلوب میں ہوتے ہوئے بھی حسنِ بیان اور جدّتِ اسلوب کی بہترین مثال ہیں۔

سادہ اسلوب میں ندرتِ ادا اور خوب صورت اندازِ بیان پر مشتمل مزید اشعار ملاحظہ کریں:

## تمثیلی اسلوبِ بیان :

تمثیلی اسلوب سے مراد یہ ہے کہ تمثیلوں اور علامتوں کے ذریعے مذہبی، اخلاقی اور فلسفیانہ امور و مسائل بیان کیے جائیں۔

کلامِ نور میں ''تمثیلی اسلوبِ بیان'' کا ایک جہاں آباد ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جہاں تشبیہات و استعارات کی گلکاریاں ہیں، وہاں تمثیلی اسلوب کا گلستاں بہاروں پر نظر آتا ہے۔

غازۂ خاکِ درِ پاک جو مل جائے مجھے
شبِ تاریک میں عنوانِ سحر ہو جاؤں

اے ابرِ کرم ، شمعِ حرم ، جانِ دوعالم
سکّہ نہ چلا اور کسی کا ترے آگے

نیّرِ برجِ رسالت کی کرن جس پر پڑی
آسمانِ رشد کا وہ ماہِ کامل ہو گیا

اس گلشنِ حیات میں اے جانِ کائنات
ایسی بہار آئے کہ جو بے خزاں رہے

خونِ اہلِ بیت کی گلکاریاں تو دیکھیے
ہو گیا گلزار پل میں ریگزارِ کربلا

صحنِ گلزارِ نفس تیری نمو سے تازہ
کوچہ فکر و تخیّل میں ہے نزہت تیری

گلاب روضہ آقا ، گہر در و دیوار
چمک دمک میں ہیں رشکِ قمر در و دیوار

خوشبوؤں کی طرح گلیوں سے گذرنا لوگو
شہرِ سرکار میں پھولوں کی ادا ہوجانا

مکتبِ عشقِ نبی سے جس کو مل جائے سبق
حکمت و دانش کا وہ کوہِ گراں ہو جائے گا

نعتِ نبی کے قمقمے روشن جو ہو گئے
حیرت سے دیکھنے لگا دیوار و در کو میں
مائلِ لطف جو میرا مہِ کنعاں ہوگا
رشکِ صد مصر مرے دل کا بیاباں ہوگا
پیرہن پائے گا خاکِ رہِ سرکار کا جب
میری قسمت کا ستارا بھی درخشاں ہوگا
جس کے اطراف میں اے نور اجالے ہیں بہت
عشقِ سرکار سے سینہ وہ فروزاں ہوگا
نکھر کر روپ اس کا جو ہوا جاذب نظر اتنا
یہ سرخی چہرۂ اسلام پر ہے خونِ اصغر کی
قلم ہے نور کا، اوصاف بھی ہیں نور والوں کے
عقیدت چاہتی ہے روشنائی ماہ و اختر کی

## سوز و گداز :

سوز و گداز ایک محسوساتی کیفیت اور سراپا ذوقی وجدانی چیز ہے، جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ تاہم تقریبِ فہم کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوز و گداز (تڑپ) سے مراد یہ ہے کہ کلام میں خیال کے ساتھ جذبات بھی شامل ہوں۔ اگر یہ صفت خیال میں موجود نہ ہوگی تو تمام خوبیوں کے باوجود شعر ایک پیکرِ بے جان و روح اور ایک گلِ بے رنگ و بو رہے گا۔ خیال کتنا ہی سچا، سادہ، بلند اور باریک کیوں نہ ہو، اگر اس میں تڑپ یعنی سوز وگداز اور دلی جذبات شامل نہ ہوں تو وہ شاعرانہ خیال نہیں ہوگا، بلکہ حکیمانہ یا

واعظانہ خیال ہوگا۔ کلام میں یہ وصف پیدا کرنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ یہ وہ نعمتِ خداوندی ہے جو ہر ایک شاعر کے حصّے میں نہیں آتی۔ خوش بخت افراد ہی کو یہ دولت ارزاں ہوتی ہے۔ شعر میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شاعر کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل ہو۔ اس کے لیے زبان و بیان پر قدرت کے ساتھ دلِ گداختہ اور قلبِ سوختہ شرطِ اوّلیں ہے۔ خواجہ میر درد، میر تقی میر، فانی بدایونی اور اصغر گونڈوی کے کلام میں سوز و گداز کی کیفیت خاص طور سے پائی جاتی ہے۔

## سوز و گداز سے متعلق اشعار :

آپ نے درد سن لیا ہوتا !!!
درد کی کچھ دوا نہیں ، نہ سہی
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا
یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جائے گا
بھلا کر مجھے آپ پچھتایئے گا
کمی میری محسوس فرمایئے گا
سانس لیتا ہوں دم الجھتا ہے
بات کرتا ہوں ، آہ ہوتی ہے !!

## کلامِ نور میں سوز و گداز کی آمیزش :

جناب سید نور الحسن نور صاحب ایک ایسے دینی و روحانی خانوادے

کے چشم و چراغ ہیں، جہاں شب و روز عشقِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور عقیدتِ اولیائے کرام کے ترانے گنگنائے جاتے ہیں۔ جہاں تصوّف کے جامِ لبالب سے تشنگانِ باطن کو سیراب کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طبیعت میں سوز و گداز کی کیفیت پائی جاتی ہے، جس کا اثر ان کے کلام پر بھی نمایاں ہے۔ موصوف ایک تصوّف آشنا عالم اور نکتہ شناس شاعر ہیں۔ شعور کی منزل میں قدم رکھتے ہی سلوک و معرفت کی آواز کانوں میں گونجنے کے سبب ان کا دل مرغِ بسمل کے مانند تڑپتا ہے اور جب عشقِ رسول میں ڈوب کر اشعار موزوں کرتے ہیں تو یہی آواز بلا اختیار صدائے بازگشت بن کر ان کی سماعتِ فکر میں سوز و گداز کی تاثیر گھول دیتی ہے۔ ان کے کیف آگیں اور طرب انگیز شعری لہجے کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا سینہ سوز و گداز اور اضطراب و تپش کا ایک دہکتا ہوا آتش کدہ ہے۔

کلامِ نور کی ایک اہم خصوصیت سوز و گداز ہے اور یہ وہ وصف ہے جس کے بغیر شعر میں تاثیر پیدا نہیں ہوسکتی۔ لیکن سوز و گداز، آہ و بکا اور جزع و فزع کا نام نہیں، بلکہ دل کی ایک لطیف دردمندانہ کیفیت کا نام ہے، جو جناب نور جیسے دردمند دل رکھنے والے شاعر کے کلام میں جابجا موجود ہے۔

یوں تو ان کا بیشتر کلام سوز و گداز، مچلتے جذبات اور قلبی اضطراب کا شہکار نمونہ ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ ان کی یہ نعت سوز و گداز میں اپنی مثال آپ ہے۔

## نعت شریف

خاکِ در بن کے رہوں، خاکِ شفا ہو جاؤں
خود میں اپنے مرضِ دل کی دوا ہو جاؤں

جسم میرا مجھے طیبہ نہیں جانے دیتا
اس سے اچھا ہے کہ میں بادِ صبا ہو جاؤں
جب مدینے کو چلوں اشک ہوں سرمایہ مِرا
واپسی ہو تو میں گھنگھور گھٹا ہو جاؤں
جن کے سر پر ہے ترا دستِ کرم سایہ فگن
ان کا انداز بنوں ان کی ادا ہو جاؤں
ہو گئی دیر بہت اب تو بلا لو مجھ کو
کہیں ایسا نہ ہو میں خود سے خفا ہو جاؤں
دل میں ارمان یہ رکھتے ہیں مرے حرف ونوا
نعت سرکار بنوں، حمدِ خدا ہو جاؤں
انگلیاں نعت رقم کرنے کو بیتاب رہیں
جان کہتی ہے مری حرف و نوا ہو جاؤں
میں ہی وہ سنگ بنوں جس پہ قدم وہ رکھیں
میں ہی سرکار کا نقشِ کفِ پا ہو جاؤں
اک نظر مجھ پہ جو پڑ جائے مِرے آقا کی
قابلِ قافلۂ راہِ وفا ہو جاؤں
خواب میں کوچۂ سرکار میں ہو میرا وجود
اور کھلے آنکھ تو مصروفِ ثنا ہو جاؤں
آخری وقت یہ ہے میری تمنا آقا
دیکھ لوں تجھ کو ہم آغوشِ قضا ہو جاؤں

اپنے قدموں میں بٹھا لے جو ترے در کا گدا
آسمانوں کی پہنچ سے بھی ورا ہو جاؤں
پیرہن پھول کا مل جائے اگر نوؔر مجھے
تو نثارِ رہِ محبوب خدا ہو جاؤں

(کلام نور) ☆☆☆

## فکرانگیز جوشِ بیان :

جوشِ بیان، کلام کا ایک اہم وصف ہے جو لوگوں کے تارِ احساس کو جھنجھوڑ کر عالمِ وجد و حال کا نقشہ نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ جوشِ بیان کا مطلب ہے شعر سن کر یہ اثر مرتب ہو کہ خود مضمون نے شاعر کو اس کے اظہار پر آمادہ کر دیا ہے، یعنی اس نے محنت و کاوش کر کے مضمون بیان نہیں کیا ہے بلکہ خود مضمون نے شاعر کو ایسا شعر کہنے مجبور کر دیا ہے۔

حالی کے بقول: ''جوشِ بیان'' کا مفہوم یہ ہے کہ:

جوشِ بیان سے صرف یہی مراد نہیں کہ شاعر نے جوش کی حالت میں شعر کہا ہو، یا شعر کے بیان سے اس کا جوش ظاہر ہوتا ہو، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو لوگ مخاطب ہیں، ان کے دل میں جوش پیدا کرنے والا ہو۔ اور اس غرض کے لیے ضروری کہ ان کے دل ٹٹولے جائیں اور ان کے دلوں کو جذب کرنے کے لیے ایک مقناطیسی کشش بیان میں رکھی جائے۔

(مقدّمہ شعر و شاعری، ص: ٦٨-٧٠؛ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی)

جناب سید نور صاحب کی تقدیسی شاعری میں زبان و بیان کی چاشنی اور ترسیلِ افکار و معانی کی خوبیوں کے ساتھ ایک قابلِ ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ

اس میں فکر انگیز جوشِ بیان اور صحت مند روایات کا اظہار پایا جاتا ہے۔ تنوّع ،تاثّر ،شائستگی ،نزاکت اور نغمگی اس پر مستزاد ہیں۔

جناب نور کے فنی تجربات اور شعری کائنات وسیع ہے ،جس میں افکار و معانی کی جلوہ آرائیاں نو واردانِ سخن کے لئے مشعلِ راہ کا کام انجام دیتی ہیں۔

مثال :

ہے بارگہِ شاہِ رسولاں مرے آگے
کیا چیز ہے پھر جنّتِ رضواں مرے آگے
ہے خاکِ درِ سیدِ کونین مرے پاس
رکھّے نہ کوئی لعل بدخشاں مرے آگے
انوارِ مدینہ سے مرا ذہن ہے روشن
مہتاب ہے انگشت بدنداں مرے آگے
آقائے دوعالم کے گداؤں کا گدا ہوں
ہیں کاسہ بکف دہر کے سلطاں مرے آگے
جن پر نہ ہوا نعت کا احسان ابھی تک
بھرتے رہیں پانی وہ سخنداں مرے آگے
ہاتھوں میں مرے نسبتِ آقا کا علم ہے
جرات ہے تو آئے غمِ دوراں مرے آگے
اے نور ہے چہرے پہ غبارِ رہِ طیبہ
ہیں خاک بسر سب مہِ تاباں مرے آگے

(کلام نور)

ہر اوج کا سر جھکتا ہے شاہا ترے آگے
کوئی بھی تو لگتا نہیں اونچا ترے آگے
اللہ رے اے پائے نبی تیرا تقدّس
رگڑے ہیں جبیں بلبلِ سدرہ ترے آگے
کیا منصبِ عالی ہے ترا کس کو پتہ ہے
گردوں کو بھی آتا ہے پسینہ ترے آگے
معراج تری ہے مرے ادراک سے باہر
معراج مری ، خاک میں ملنا ترے آگے

☆☆☆

اک طفلکِ ناداں درِ خیر البشری کا
دنیا کو سکھا سکتا ہے فن شیشہ گری کا
سرکار کے آنے سے ہوا کام مکمّل
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا
رکھا جو مدینے میں قدم سرورِ دیں نے
عنوان ہر اک ذرّہ ہوا دیدہ وری کا

☆☆☆

بیان کرتا ہے یہ نطق اعتلائے فلک
ہیں نقشِ پائے نبی باعثِ ضیائے فلک
مہ و نجوم ہیں خاکِ دیارِ سرورِ دیں
وگر نہ کب تھا یہ ممکن کہ جگمگائے فلک

لوحِ ایجادات پر جب ارتقا لکھا گیا
نام نامی سرورِ کونین کا لکھا گیا
مسکنِ خیر الوریٰ کا جس کو حاصل ہے شرف
اس زمیں کو نازشِ عرشِ علیٰ لکھا گیا
اے شہِ خوبانِ عالم تیرے جلوؤں کے طفیل
ذرّہ ذرّہ غیرتِ ماہِ درخشاں ہو گیا
نیّرِ برجِ رسالت کی کرن جس پر پڑی
آسمانِ رشد کا وہ ماہِ کامل ہو گیا

(کلام نور) ☆☆☆

حالی کی رائے میں جوشِ بیان کے لئے ضروری ہے کہ ایک مقناطیسی کشش بیان میں رکھی جائے۔ادب کے باذوق قارئین مندرجہ بالا اشعار (جو میر تقی میر اور غالب جیسے اساتذہ سخن کی غزلیہ زمیں میں ہیں) میں فکر انگیز جوش بیان اور مقناطیسی کشش کی جھلکیاں بخوبی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

جناب نور صاحب کی فکری جہات پر تبصرہ کرتے ہوئے عصر حاضر کے ممتاز نعت گو شاعر اور دیدہ ور ناقد جناب یاور وارثی تحریر کرتے ہیں:

جناب سید نور الحسن نور نوابی دام ظلہ کا اسلوبِ بیان جدید، فکر عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مظہر، زبان عشق رسول کا پیکر، نگاہ عظمتوں کی امین اور خیال رفعتوں کی معین ہے۔ (قلزم نور، ص:۱۶)

اس کے بعد اول الذکر دونوں کلام کے بارے میں کہتے ہیں:

اساتذہ کی یہ زمینیں دیکھئے اور حضرت نور کی پروازِ فکر کے ساتھ جدت اور ندرتِ خیال بھی ملاحظہ فرمایئے کہ کس خوبی سے اپنے دور کی نمائندگی کی

ہے اور وہ بھی اتنی قدیم زمین میں کہ جن کو چھونے سے ہی کتنوں کا پِتّہ پانی ہو جائے گا۔ ''آنکھوں کو پیاس لگنا اور ذرّوں کی دیدہ وری'' یہ آپ ہی کا حق ہے اور کیوں نہ ہو کہ جس کی شان میں قصیدہ کہا جارہا ہے، کہنے والا اسی خاندان کا چشم و چراغ ہے، اسی کی آلِ پاک ہے۔ (ایضاً، ص:۲۴)

## شعریت و نشتریت :

پرستارانِ شعر و سخن کے درمیان یہ جملہ بار بار سننے کو ملتا ہے کہ'' فلاں شعر میں شعریت پائی جاتی ہے یا فلاں شعر میں شعریت کی چاشنی موجود ہے''۔ آخر ''شعریت'' کیا چیز ہے؟

اس سوال کا جواب پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی زبانی ملاحظہ کریں:

شعر کی خوبی کا معیار نہ اسلوب میں ہے اور نہ موضوع میں، بلکہ'' شعریت'' میں ہے۔ شعریت وہ حسنِ کلام ہے جس کی بدولت ذہنِ سامع کو لطف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ یعنی شعریت سے معمور شعر میں جذبات کی ایسی شدّت ہو، ایسی والہانہ کیفیت ہو اور ایسا چونکا دینے والا اسلوب ہو کہ خیالات کی ایک دنیا سامنے آجائے اور سننے والا محوِ حیرت ہو کر رہ جائے۔ اسی وصفِ خاص کو بعض اربابِ فن ''معنویت یا نشتریت'' سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اس کی بنا پر شعر اور شاعر دونوں کی عظمت دل میں جاں گزیں ہو جاتی ہے، بلکہ انسان اس کے اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ غالب نے اسی معنویت یا نشتریت کو ''چیزے دگر ورائے شاعری'' سے تعبیر کیا ہے، جس کی بدولت سامع پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم
ورائے شاعری چیزے دگر ہست

جس شعر میں شعریت اور معنویت اپنے کمال پر پہنچ جاتی ہے، وہ شعر جادو بن جاتا ہے۔

(شرحِ دیوان غالب،ص:۷۷-۷۸؛عشرت پبلشنگ ہاؤس،لاہور)

شعریت ونشتریت کے حوالے سے مندرجہ ذیل اشعار بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

شعریت ونشتریت سے بھرپور یہی وہ شعر ہے جس کے بدلے میر کو غالب اپنا پورا دیوان دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ سچ کہا گیا ہے:

قدرِ جوہر می شناسد جوہری ؎

دیکھا تو ہم نے ہوگا ازل میں ترا جمال
لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا

بیتابیوں نے کام دیا دستِ ناز کا
آخر لپٹ کے سو گئے دردِ نہاں سے ہم

وہ اشک بھری آنکھیں، یہ درد بھرے نالے
اللہ نہ دکھلائے جو وقتِ سحر دیکھا

**نمونہ کلام :**

عشقِ رسول جان و جگر میں اتار کے
بیٹھا ہوں کائنات کو ٹھوکر پہ مار کے
ہو جائے گا فراخ نگاہوں کا دائرہ
پلکوں سے دیکھ کوچہ طیبہ بہار کے
سرکار کا ہے نقشِ کفِ پا مرے آگے
سر رکھے ہے ہر اوجِ تمنّا مرے آگے
جب نزع کا ہو وقت، کوئی لے کے کھڑا ہو
اے گنبدِ خضریٰ ترا طغریٰ مرے آ گے
شہرِ نبی کی سمت جو روئے سفر ہوا
افلاک عظمتوں کے مرے ہم قدم ہوئے
ردائے سرورِ کونین تیرے صدقے میں
زمین والوں پہ تانی گئی ردائے فلک
جب تک مری زباں کا وظیفہ درود تھا
رحمت سے ہم کنار جہانِ وجود تھا
آخر یہ برف پگھلی تو نعتِ رسول سے
ورنہ خیال و فکر پہ طاری جمود تھا
طیبہ کی گردِ راہ کو بھی چومتے چلو
تحریر ہے یہ عشقِ نبی کی کتاب میں
رکی ہیں وقت کی سانسیں، تھمی ہے نبضِ جہاں
چلے ہیں شاہِ امم سیرِ لا مکاں کے لیے

تمہاری زیست کا مقصد درِ شہِ دیں ہے
طوافِ بارگہِ انجم و قمر نہ کرو
کھلتے ہیں التفات و کرم کے ہزاروں گل
در مصطفیٰ کا جانِ محبت ہی آج بھی

## کلام نور کا محاکاتی انداز :

مرزا یاس عظیم آبادی ''چراغِ سخن'' میں لکھتے ہیں کہ: ''ایک اچھے شعر میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں۔ وزن، قافیہ، مناسبت الفاظ، بندش کی صفائی، محاکات (یعنی کسی شے یا حالت کی ہو بہو تصویر کشی) اور تخیّل۔ مگر محاکات اور تخیّل، یہ دونوں چیزیں شاعری کے اصلی عناصر ہیں''۔

اس کے بعد ''محاکات'' کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

محاکات کسی چیز یا کسی حالت کی نقل اتارنے کو کہتے ہیں، جس سے اس چیز کی حالت کی ہو بہو تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔

(چراغِ سخن، ص: ۵۶، مجلسِ ترقی ادب، لاہور)

علامہ سید سلیمان اشرف بہاری (استاذ پروفیسر رشید احمد صدیقی) نے اپنی مایۂ ناز ادبی و تحقیقی کتاب ''مقدّمہ مثنوی ہشت بہشت معروف بہ (الانہار)'' میں محاکات کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

محاکات کے معنی ''نقّالی'' کے ہیں، یعنی جو واقعہ جس طرح دیکھا یا سنا جائے یا جو اثر و کیفیت کہ دل پر گذرے، اس کو اس طرح ادا کر دیا جائے کہ غائب اسے سن کر اپنے کو حاضر سمجھنے لگے۔

(الانہار یعنی مقدّمہ مثنوی ہشت بہشت، ص: ۵، نوریہ رضویہ

پبلشنگ، لاہور)

سید نور صاحب نے تشبیہ واستعارہ کی طرح محاکات سے بھی اپنے کلام کی تمثیل وتزئین اور تشریح وضاحت کا کام بخوبی انجام دیا ہے اور بعض مقامات پر ''محاکات'' کا انداز پیش کرتے ہوئے اس طرح منظر نگاری کی ہے کہ اصل واقعہ کی تصویر ہو بہو نگاہوں کے سامنے پھر گئی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار دیکھیں کہ واقعۂ معراج اور بالخصوص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا کے حضور باریابی کا نقشہ کس خوب صورتی کے ساتھ کھینچا گیا ہے۔

کون جانے کیا ہے رتبہ سرورِ کونین کا
عرش نے بوسہ لیا ہے آپ کے نعلین کا
آ رہی تھیں ''اُدنُ منّی'' کی صدائیں بار بار
قرب بڑھتا جا رہا تھا کس قدر مابین کا
پہنچے جب آغوشِ ''او ادنیٰ'' میں محبوبِ خدا
ختم سارا ہو چکا تھا فاصلہ ''قوسین'' کا

اسی طرح حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعضائے مبارکہ مثلاً: چہرۂ اقدس، دستِ اطہر، پائے ناز وغیرہ کا ذکر انہوں نے محاکاتی انداز میں کیا ہے۔

جانِ قمر ہے تابشِ رخسارِ مصطفیٰ
عنبر فشاں گیسوئے خمدارِ مصطفیٰ
تازہ ہوا، مہکتی فضا، گل بکف دیار
آنکھوں نے دیکھا خلد کا منظر زمین پر
چہرۂ والضحیٰ سے پھوٹی کرن
ہر طرف بکھرے نور کے جلوے

## ترنّم اور موسیقیت :

شاعری ،فنونِ لطیفہ کی ایک قسم ہے جس میں ''موسیقیت'' کا اضافہ سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔موسیقیت لفظوں کی صوت ، بحر اور وزن سے تشکیل پانے والا وہ خاص صوتی آہنگ ہوتا ہے جس کے باعث شعر میں معنوی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔لفظ کی موسیقیت دو صورتوں میں موجود ہوتی ہے۔ایک لفظ کی خارجی موسیقیت جس کا تعلق لفظ کی صوت ( آواز ) سے ہوتا ہے اور دوسرا لفظ کی داخلی موسیقیت جس کا تعلق لفظ کی معنوی تاثیر سے ہوتا ہے۔لفظ کی اس داخلی اور خارجی موسیقیت کے امتزاج سے ہی وہ شعری آہنگ پیدا کیا جاتا ہے جو ''شعر کی موسیقیت'' کہلاتا ہے۔کلام میں موسیقیت کی کیفیت پیدا کرنے میں کچھ مخصوص بحروں کے علاوہ الفاظ کی مناسب اور برمحل نشست و برخاست ،موزوں فقرے اور قوافی کے علاوہ ہم وزن الفاظ وکلمات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔موسیقیت میں ایک بڑا عمل دخل الفاظ کی ترتیب کا بھی ہوتا ہے۔الفاظ کی ظاہری ترتیب وساخت کے علاوہ بعض اوقات الفاظ اپنی معنوی تاثیر سے بھی سامع کے ذہن میں موسیقیت پیدا کر دیتے ہیں۔

جناب نور صاحب کے کلام کی ایک فنی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ''ترنم اور موسیقیت'' کی کیفیت پائی جاتی ہے، جو سامعین کے دلوں کو چھو لیتی ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار میرے دعویٰ کو دلیل فراہم کرتے ہیں۔

اے ابرِ کرم ، شمعِ حرم ، جانِ دوعالم
سکّہ نہ چلا اور کسی کا ترے آگے

خلیل آئے ، ذبیح آئے ، کلیم آئے ، مسیح آئے
مگر نہ آیا جواب کوئی رسولِ عالی خصال تیرا
ہے عرشِ اعظم پہ اس کی قسمت ، ملی ہے جس کو تری محبت
ترا تقرّب ، تقرّبِ حق ، وصالِ حق ہے ، وصال تیرا
رنگ کا ، نور کا ، خوشبو کا ، حسیں جلوؤں کا
ایک میلہ سا لگا ہے ترے دربار کے پاس
غمِ دنیا ، غمِ مرقد کہ غمِ محشر ہو
سب غموں کا ہے مداوا مرے سرکار کے پاس
شرافت ہو ، نجابت ہو ، سیادت ہو ، کرامت ہو
کوئی عظمت ہو لوگوں تک انہیں کے گھر سے آئی ہے
فلک نے آنچل میں ان کو اپنے سجا لیا جان کر ستارا
نبی کی یادوں کے چند موتی جو میری پلکوں پہ جھلملائے
چمک اٹھیں شاخِ دل کی کلیاں ، مہک اٹھے فکر کے دریچے
مرے خیالوں کی انجمن میں حضور جب آ کے مسکرائے
جہاں میں نام ہے روشن نبی کے چار یاروں سے
صداقت کا ، عدالت کا ، سخاوت کا ، شجاعت کا

## متوازن فقرے اور موزوں کلمات :

حسرت موہانی کے بقول:
الفاظ و فقراتِ موزوں کا تعدّد بھی عموماً ازدیادِ حسنِ سخن کا باعث ہو جایا کرتے ہیں۔ مثلاً:

نہ ترّحم ، نہ تکلّم ، نہ تبسّم ، نہ نگاہ
کس طرح یہ دلِ ناشاد بھلا شاد رہے

(محاسنِ سخن،ص:۵۹،اصحّ المطابع،کان پور)

متوازن فقرے اور موزوں کلمات بھی بعض اوقات شعر کے حسن و دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔شعر میں جب متوازن فقرے جمع ہوتے ہیں تو ان میں موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے،جو شاعری کا جزوِ لطیف ہے۔

**متوازن فقروں کی مثال :**

بیتاب نظر آیا ، بد نام نظر آیا
عاشق جو نظر آیا ، بدنام نظر آیا
رعنائی و زیبائی و خوبی و محبوبی
کیا بات ہے جو اس قدِ رعنا میں نہیں ہے

(حسرت موہانی)

جناب سید نور نے سلاستِ زبان اور صفائی بیانِ کے سہارے اپنی شاعری میں ''موزوں و متوازن فقروں'' کے انبار لگا دئے ہیں،جس سے شعر کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

**نمونۂ کلام :**

اے ابرِ کرم ، شمعِ حرم ، جانِ دوعالم
سکّہ نہ چلا اور کسی کا ترے آ گے
رنگ کا ، نور کا ، خوشبو کا ، حسیں جلووں کا
ایک میلہ سا لگا ہے ترے دربار کے پاس

بولیں شجر نبی نبی ، بولیں حجر نبی نبی
گونجے صدا طرف طرف شام و سحر نبی نبی
غمِ دنیا ، غمِ مرقد کہ غمِ محشر ہو
سب غموں کا ہے مداوا مرے سرکار کے پاس
شرافت ہو ، نجابت ہو ، سیادت ہو ، کرامت ہو
کوئی عظمت ہو لوگوں تک انہیں کے گھر سے آئی ہے
جہاں میں نام ہے روشن نبی کے چار یاروں سے
صداقت کا ، عدالت کا ، سخاوت کا ، شجاعت کا

☆☆☆

## مضمونِ شعر و الفاظِ شعر میں مطابقت :

حسرت موہانی لکھتے ہیں:

مضمونِ شعر اور الفاظِ شعر میں مطابقت قائم کرنا ، منجملہ کمالاتِ شاعری بہت کچھ اہم سمجھا جاتا ہے اور عموماً بہت بڑی فنی قوت اور مشقِ سخن کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ مثلاً:

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رند شرابی کا
بِھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا

پہلے مصرع میں رندی و بیبا کی کے مضمون کی مناسبت سے مصرع ثانی میں شاعر نے ''لگا دے'' کی جگہ ''بھڑا دے'' لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

(محاسنِ سخن، ص: ۵۰، اصحّ المطابع، کان پور)

مضمونِ شعر اور الفاظِ شعر میں مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنا ،

شاعرانہ کمال کی دلیل ہے۔ کلام میں یہ صفت، بلاغت سے پیدا ہوتی ہے۔ بلاغت کی تعریف میں جو یہ کہا گیا کہ ''کلام اقتضائے حال کے موافق ہو''، بہت جامع و مانع تعریف ہے۔ جو شاعر بلاغت آشنا ہوتا ہے، وہ اپنے کلام کو اقتضائے حال کے موافق اور مضمونِ شعر و الفاظِ شعر میں مطابقت قائم کر کے اس میں حسن و دلکشی اور سحر آفرینی کا رنگ گھول دیتا ہے۔ انسان میں گونا گوں خیالات و جذبات پائے جاتے ہیں۔ کبھی غم و غصہ ہے اور کبھی مسرت و شادمانی۔ ایک وقت بیتابی و بیقراری ہے تو دوسرے وقت راحت و سکون۔ کبھی مستی و بیہوشی ہے اور کبھی باخودی و ہوشیاری۔ پس جس حالت و کیفیت کا بیان ہو، اگر کلام اس میں اس طرح ڈوبا ہوا ہے کہ کہنے والا کہہ رہا ہے اور سننے والے کی آنکھوں میں اس کا نقشہ کھنچا جاتا ہے۔ تفصیل کی جگہ وضاحت ہے اور اجمال کی جگہ اختصار، تو اس وصف سے متصف کلام کو اس وقت بلیغ کہا جائے گا اور کلام میں یہی کیفیت و خصوصیت پیدا کرنے کا نام ''بلاغت'' ہے۔

جناب سید نور الحسن صاحب ایک وسیع النظر عالم و فاضل اور بلاغت آشنا ادیب و شاعر ہیں۔ ان کی وسیع تر شعری کائنات، فکری و فنی نظام، طرفگیِ خیالات، والہانہ اظہارِ جذبات، سوزِ دروں، قلبی التہاب، الفاظ و معانی کی طہارت، فصاحت و بلاغت، فنی انسلاکات، تشبیہات و تلمیحات، استعارات و کنایات، شعریت و ادبیت، مصوّری و منظر نگاری اور شگفتگی و پختگی قارئین کے دامانِ دل کو اپنی جانب بار بار کھینچتی ہے۔

موقع و محل کی مناسبت سے اپنے افکار و خیالات کو کہاں کس انداز سے پیش کرنا ہے، مضمون کے مطابق الفاظ کیسے ہوں، وہ ان حقیقتوں سے خوب واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کلام میں مضمون کے حسبِ حال الفاظ

لاتے ہیں اور مضمونِ شعر و الفاظِ شعر میں مطابقت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔
اس تعلق سے بعض امثال و نظائر پیشِ خدمت ہیں:

تازہ ہوا ، مہکتی فضا ، گل بکف دیار
آنکھوں نے دیکھا خلد کا منظر زمین پر

اس شعر کا مضمون مدینہ منورہ کے حسن و جمال سے متعلق ہے۔ یعنی اس مبارک سرزمین کی آب و ہوا میں لطافت و تازگی، فضا میں خوشبوؤں کی پھوہار اور اس کے ذرے ذرے میں پھولوں کی قطار کھڑی ہے۔ اب مضمونِ شعر کا تقاضا تھا کہ دوسرے مصرعے میں ایسا لفظ لایا جائے جو اس حال و کیفیت سے مناسبت رکھتا ہو۔ تو شاعر نے اس کے کے لیے ''خلد یا منظرِ خلد'' کا لفظ استعمال کیا، جو ماقبل کی حالت سے خوب مناسبت رکھتا ہے۔ یہی ہے مضمونِ شعر اور الفاظِ شعر میں مطابقت، جو شعر کے حسن کے اضافے کا ایک سبب ہے۔

چہرۂ والضحیٰ سے پھوٹی کرن
ہر طرف بکھرے نور کے جلوے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور سے منعکس ہونے والی روشنی کے مضمون کو ''جلوۂ نور بکھرنے'' کے الفاظ سے تعبیر کرنا بھی مضمونِ شعر و الفاظِ شعر میں مطابقت کی ایک بہترین مثال ہے۔ اسی طرح شاعر محترم نے ناامیدی کی شبِ دیجور میں امید کی کرن پھوٹنے اور جلتی سلگتی ناامیدی کی کھیتی میں امید کی موسلا دھار برسات ہونے سے متعلق مضمون کو جن الفاظ و اسلوب سے ادا کیا ہے، وہ بھی مندرجہ ذیل شعری حسن کا ایک نادر نمونہ ہے۔

تمام جلتی سلگتی امیدیں ہنسنے لگیں
اٹھا جو جھوم کے ابرِ عطائے سرورِ دیں

معزّز قارئین ! اس حوالے سے مزید چند اشعار بلا توضیح وتشریح آپ کی بصارتوں کی نذر کرتا ہوں۔ آپ غور کر کے خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان میں مضمون وموضوع کے مطابق الفاظ کا استعمال کتنے بہتر انداز میں ہوا ہے۔

ہر قطرہ تیرے ابرِ کرم کا مرے کریم
کشتِ حیات کے لیے'' آبِ بقا '' ہوا
تمہاری یاد کے گلزار جس سے ہوں شاداب
یہ چشمِ نم مری وہ'' آبشار'' ہو جائے
مائلِ لطف جو میرا '' مہِ کنعاں '' ہوگا
رشکِ صد مصر مرے دلِ کا بیاباں ہوگا
کر بلا کی ریت پر ایسا گل'' وانحر'' کھِلا
جس کے آگے ہر چمن زارِ رضا سجدے میں ہے
غازۂ خاکِ درِ پاک جو مل جائے مجھے
شبِ تاریک میں عنوانِ سحر ہو جاؤں

☆☆☆

مندرجہ بالا اشعار کے مضامین نظر میں رکھیں اور ان کے مطابق الفاظ وتراکیب'' آب بقا'' آبشار'' رشکِ صد مصر'' اور'' عنوانِ سحر'' پر غور کریں۔ مضمونِ شعر اور الفاظِ شعر میں مطابقت کی اس سے بہتر مثالیں کم ہی دیکھنے کو ملیں گی۔

## رنگِ تغزّل :

شعر وادب میں تغزّل کا مفہوم ہے: کلام میں غزل کی یا غزل جیسی کیفیت پیدا کرنا''۔تغزّل بنیادی طور پر ایک کیفیت کا نام ہےاوراس کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی جا سکتی۔ یہ غزل میں پایا جانے والا ایک ایسا وصف یا حسن ہے، جس کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، بیان نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ تغزل صرف غزل میں ہی موجود ہو، یہ کوئی ضروری نہیں۔ اِس کا وجود کسی بھی صنفِ سخن میں ہوسکتا ہے۔مگر عمومی طور پر غزل ہی میں تغزّل ہوتا ہے۔غزل یا کسی دوسری صنف میں تغزّل کی موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ اس میں غزل کی داخلی روح ایسی ہو، جو قاری یا سامع کو فرحت و مسرت کے ساتھ بصیرت کا سامان مہیا کرے۔

جناب سید نور صاحب ایک سچے عاشقِ رسول ہیں۔ان کے سینے میں وہ دل ہے جو ہمیشہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں دھڑکتا اور تڑپتا رہتا ہے۔ان کی نعتیہ شاعری، عشق وعقیدت کی ترجمان ہے۔ان کے کلام سے مطالعہ سے ان کے قلبی اضطراب، سوزِ دروں، کسک، آہ وفغاں اور درد کی شدّت کا اندازہ ہوتا ہے۔موصوف نے اپنے قلبی جذبات اور کرب میں ڈوبی ہوئی دلی کیفیات کو چوں کہ الفاظ کا جامہ پہنا کر ہو بہو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے، اس لیے اس میں بلاقصد وارادہ ''تغزّل'' کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ان کے تغزّلانہ اشعار پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک عاشقِ شیدا اپنے محبوب کے ہجر وفرقت میں مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہے۔ایک سچے عاشقِ رسول ، بلکہ فنا فی الرسول کی جو حالت و کیفیت ہوا کرتی ہے، وہی

کیفیت ان کی نعتیہ شاعری میں پائی جاتی ہے۔ رنگِ تغزّل، اسی حالت و کیفیت کا نتیجہ ہے۔

**نمونۂ کلام :**

اس گلشن حیات میں اے جانِ کائنات
ایسی بہار آئے کہ جو بے خزاں رہے
مائلِ لطف جو میرا مہ کنعاں ہوگا
رشکِ صد مصر مرے دل کا بیاباں ہوگا
ملے بوسہ اگر آقا کے پائے نازِ اطہر کا
تو لیں اہلِ نظر بوسہ مرے روئے مقدر کا
ملا صدقہ صبا کو نکہتِ زلفِ معنبر کا
تو سینہ خوشبوؤں سے بھر گیا ہر اک گلِ تر کا
کس ماہتاب نے یہ بکھیری ہے چاندنی
انوار کا ہجوم ہے ''غارِ حرا'' کے پاس
شب خواب وعدہ ہوتا جو حضور کے کرم کا
درِ آرزو پہ روشن گلِ انتظار ہوتا
وہ آئیں گے سرِ بالیں مجھے امیدِ کامل ہے
وگرنہ دم مرا آنکھوں میں یوں اٹکا نہیں ہوتا
دمِ آخر ذرا تم مسکرا دو سامنے آ کر
میں ہنس کر جان دے دوں گا تمہارے مسکرانے سے
کرم ہو میری جاں پر اک جھلک بس دیکھ لوں تم کو
ہوا ہے مرغِ بسمل دیدہ خوں بار آنکھوں میں

خوشی کے دن میں بھی تم کو بھلا نہ پایا میں
تمہاری یاد غموں کی سیاہ رات میں ہے
تمہاری یاد ہی تسکینِ جاں کا ہے ساماں
مرا قرار تمہاری نوازشات میں ہے
آنکھیں لگی ہوئی ہیں تری راہ کی طرف
محفل سجی ہوئی ہے ، ترا انتظار ہے
سنتا ہوں آ رہے ہیں وہ گل گشت کے لیے
گلزارِ دل میں جوش پہ فصلِ بَہار ہے
جن کی آمد کی تھی منتظر بزمِ کُن
مرحبا ! وہ گل خوش ادا آ گئے

☆☆☆

**روزمرّہ :**

روزمرّہ، فصاحت کا ایک حصّہ یا اس کا فردِ خاص ہے۔ کیوں کہ جب کسی کلام کو ''فصیح'' کہا جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہی ہوتا ہے کہ وہ زبان و بیان اور صرف ونحو کے مسلّمہ اصول کے مطابق ہونے کے ساتھ محاورہ اور روزمرّہ گفتگو کے موافق ہو۔ اصلاحِ ادب میں جو الفاظ اور خاص ترکیبیں اہلِ زبان کے بول چال میں زیادہ مستعمل ومتداول ہوں، ان کو ''روزمرّہ'' کہتے ہیں۔

(موازنہ انیس ودبیر، ص:۴۶، لالہ رام نرائن لعل بک سیلر، الٰہ آباد)

روزمرّہ کیا ہے؟ اسے آسان لفظوں میں یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ عام بول چال میں کہتے ہیں: ''دو چار روز پہلے کی بات ہے''۔ یہ روزمرّہ

ہے۔ کیوں کہ عام بول چال میں اہلِ زبان بالعموم اسی طرح بولتے ہیں۔ اب اگر کوئی اس کے بجائے یوں کہے کہ ’’دو تین روز یا دو پانچ روز پہلے کی بات ہے‘‘ تو یہ خلافِ روزمرّہ ہے۔ اسی طرح عرف عام میں بولتے ہیں: ’’منہ مانگا انعام دوں گا‘‘ یہ روزمرّہ ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ ’’منہ چاہا انعام دوں گا‘‘ تو یہ خلافِ روزمرّہ ہوا۔

فصیح کلام بالعموم محاورہ اور روزمرّہ پر مشتمل ہوا کرتا ہے، تو اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ’’روزمرّہ‘‘ میں فصاحت کی آمیزش ضرور ہو گی اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اسی طرح اردو میں جتنے بھی محاورے عام بول چال میں استعمال کیے جاتے ہیں، ان میں بھی بڑی حد تک روزمرّہ کا وصف پایا جاتا ہے۔ تشبیہ و استعارہ اور صنائع کی طرح محاورہ، کہاوت (ضرب المثل) اور روزمرہ کے برمحل اور مناسب استعمال سے کلام کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

جناب سید نور صاحب کے کلام میں فصاحت و بلاغت اور اردو محاورات کے استعمال پر تفصیلی گفتگو گذشتہ صفحات میں ہو چکی ہے اور نمونے کے طور پر اشعار بھی پیش کیے جا چکے ہیں۔ ان مذکورہ اشعار میں جہاں فصاحت و بلاغت کی صفت پائی جاتی ہے، وہیں ’’روزمرّہ‘‘ کا وصف بھی شامل ہے۔ تاہم چند اشعار یہاں بھی مثالاً پیش کیے جاتے ہیں۔

جو دشتِ کربلا میں خون کی بوندوں نے لکھی ہیں
کبھی وہ مٹ نہیں سکتی، لکیریں ہیں وہ پتھر کی
کسی طرح کی بھی اڑچن نہ راہ میں آئی
اشارا ان کا ہوا اور بیڑا پار ہوا

یہی ہے حاصلِ ایماں ، یہی ہے حاصلِ دیں
نبی کی بات جب آئے ، اگر مگر نہ کرو
ہوں غلام ان کا تو قدموں میں رہوں گا ان کے
آخرش حق کو پہنچ جانا ہے حق دار کے پاس
گلشن گلشن اس لئے اس کو گلے لگائے اپنے نور
بادِ صبا کا روز مدینہ آنا جانا رہتا ہے
پہلے بھی آپ صدر تھے بزمِ حیات کے
جاری یہ جلسہ زیرِ صدارت ہے آج بھی
لاکھوں میں ایک یہ بھی ہے اس در کی خاصیت
لگتی نہیں ہے ٹھیس کبھی اعتبار کو
ہر مراد منہ مانگی بالیقیں وہ پائیں گے
جو بھی میرے خواجہ کے در سے لو لگائیں گے

☆☆☆

## آسان زبان، سادہ طرزِ بیان :

حالی نے ''مقدّمہ شعر وشاعری'' میں کامیاب شاعری اور لافانی کلام کی یہ علامت بتائی ہے کہ '' وہ اصلیت پر مبنی ہو، سادہ ہو اور جوش سے بھرا ہو''۔

اس جہت سے جناب سید نور صاحب کے کلام کا جب تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں بیک وقت تینوں اوصاف وخصوصیات نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں اصلیت کا جمال بھی ہے اور جوشِ بیان و

سادگی کا کمال بھی۔ ان کی شاعری میں وقیع و نادر خیالات، پرشکوہ اندازِ بیان اور الفاظ و تراکیب کی جدّت و ندرت کے ساتھ سادہ زبان، قریب الفہم لب و لہجہ اور سادہ اندازِ بیان کا حسن بھی موجود ہے۔ موصوف نے سیدھے سادے اور ہلکے پھلکے مضامین کو بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ رواں دواں اور سلیس اردو میں پیش کیا ہے۔ ان کے نعتیہ کلام میں زبان و بیان کی سادگی معنوی قدر و قیمت کو متاثر نہیں کرتی، بلکہ اس کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔ کیوں کہ یہ سادگی و پرکاری شعری تجربے سے ہم آہنگ ہے۔

نازِ کعبہ ہیں ، فخرِ قبلہ ہیں
آپ ارفع ہیں ، آپ اعلیٰ ہیں
آج محسوس ہو رہا ہے یہی
میرے سرکار جلوہ فرما ہیں
ابرِ لطفِ نبی سے ہوں سیراب
جس قدر تشنگی کے صحرا ہیں
زخمِ غم کی مجھے نہیں پروا
سرورِ دیں مرے مسیحا ہیں
نور کہتا ہوں اس لئے نعتیں
میری بخشش کا یہ ذریعہ ہیں

☆☆☆

ہر طرف سے یہی صدا آئے
مصطفیٰ آئے ، مصطفیٰ آئے

فرحت و انبساط وجد کریں
لب پہ جب نام آپ کا آئے
غیر ممکن ہے ان کے ہوتے ہوئے
میرے پیچھے کوئی بلا آئے
شاخ در شاخ گُل درود پڑھیں
نعت پڑھتی ہوئی صبا آئے
مصطفیٰ ساری رہ گزاروں میں
چھوڑتے اپنے ''نقشِ پا'' آئے
پیرہن نور کا پہن کر نور
بزمِ دنیا میں مصطفیٰ آئے

☆☆☆

مجھ سے مت پوچھ کیا ہے نعت شریف
سنّتِ کبریا ہے نعت شریف
عرشیوں کی صدا ہے نعت شریف
فرشیوں کی صدا ہے نعت شریف
مصطفیٰ رب کی اوّلیں تخلیق
نقطہ ابتدا ہے نعت شریف
زندگی رنج و غم کا صحرا ہے
رحمتوں کی گھٹا ہے نعت شریف
نور اپنا یہی عقیدہ ہے
دافعِ ہر بلا ہے نعت شریف

## سہلِ ممتنع :

''سہل ممتنع'' کے بارے میں ابن رشیق کہتے ہیں:

فـاذا قيـل أطـمـع الـنـاس طـرا
وإذا ريـم أعـجـز الـمـعـجـزينا

یعنی شعر کے انداز میں جب کوئی بات کہی جائے تو سامنے والا کہے کہ ایسا میں بھی کہہ سکتا ہوں، لیکن جب کہنے کا ارادہ کرے تو نانی یاد آجائے اور اس سے عاجز و قاصر رہے۔ آسان زبان اور سادہ طرزِ بیان سے بھی زیادہ جس میں سہولت ہو، اسے ''سہل ممتنع'' سمجھنا چاہیے۔ شعر وسخن کی اصطلاح میں ''سہل ممتنع'' اسے کہتے ہیں جس میں شعرا تنے سہل اور اسان انداز میں کہا گیا ہو کہ یہ نثر معلوم ہو۔ علاوہ ازیں اندازِ میں نہایت سادہ اور آسان ہو، لیکن مضمون میں شعریت اور بلندی ہو۔ لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ہر سادہ شعر کا شمار سہل ممتنع میں نہیں ہوتا، بلکہ وہ شعر اس زمرے میں آتا ہے جس میں کوئی بڑی بات بہت سادگی سے کہہ دی گئی ہو۔ سہل ممتنع کے لیے چھوٹی بحر کا ہونا بھی کوئی ضروری نہیں، لیکن بسا اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ چھوٹی بحر میں سہل ممتنع کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ میر تقی میر کو سہل ممتنع گوئی میں بلند مقام حاصل تھا۔

مرزا غالب کا یہ کلام ''سہل ممتنع'' کے باب میں اپنی مثال آپ ہے۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی
جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

جناب سید نور الحسن صاحب کی شاعری میں زبان و بیان کے پر شکوہ انداز و اسلوب کے ساتھ سادگی و صفائی اور سہل ممتنع کے نمونے بھی پائے جاتے ہیں۔ دیگر مجموعوں کے علاوہ بالخصوص ان کے نعتیہ مجموعہ ''مرکزِ نور'' میں سہل ممتنع کے رنگ میں رنگے ہوئے متعدد کلام دیکھنے کو ملتے ہیں۔

**نمونۂ کلام :**

ہر طرف سے یہی صدا آئے
مصطفیٰ آئے ، مصطفیٰ آئے

فرحت و انبساط وجد کریں
لب پہ جب نام آپ کا آئے
غیر ممکن ہے ان کے ہوتے ہوئے
میرے پیچھے کوئی بلا آئے
شاخ در شاخ گُل درود پڑھیں
نعت پڑھتی ہوئی صبا آئے
مصطفیٰ ساری رہ گزاروں میں
چھوڑتے اپنے ''نقشِ پا'' آئے
پیرہن نور کا پہن کر نور
بزمِ دنیا میں مصطفیٰ آئے

☆☆☆

خیالِ نبی ہم سفر ہے مرا
ستارا بڑے اوج پر ہے مرا
مدینے کی گلیوں کا ہے تذکرہ
بہاروں کا مرکز کھنڈر ہے مرا
شہِ ہر دوعالم کی مدحت گری
اثاثہ ہے میرا ، ہنر ہے مرا
مدد کیجیے میرے شاہِ اُمم
کہ ہر راستہ پر خطر ہے مرا
تری یاد ہے زندگانی مری
ترا نقشِ پا راہبر ہے مرا

غبارِ درِ شاہِ طیبہ ہوں میں
یہ مہتاب دریوزہ گر ہے مرا

☆☆☆

اشارے کر رہی ہے اے صبا کیا ؟
بلاتے ہیں مجھے شاہِ ہدیٰ کیا
ترے قدموں کی آہٹ سن رہا ہوں
مرا دل بن گیا ’’ غارِ حرا ‘‘ کیا
جو اتنا ہنس رہا ہے ماہِ انور
مرے آقا کا ہے یہ نقشِ پا کیا
انہیں پر ختم سارے فلسفے ہیں
نقوشِ ابتدا کیا ، انتہا کیا !!
سمجھ سکتا نہیں اے نورؔ کوئی
مرے سرکار کا ہے مرتبہ کیا !!

☆☆☆

# اردو محاورے: تعارف و تجزیہ

محاورے کی ادبی اور سماجی حیثیت مسلّم ہے۔ دنیا کی کسی بھی متمدن اور ترقی یافتہ زبان میں اسے کلیدی مقام حاصل ہے۔محاورات اور ضرب الامثال ہمارے مشاہدات و تجربات کو پیش کرتے ہیں۔ ان میں تہذیب و تمدن کے رجحانات ، سماج کے عقیدے اور رسم و رواج کی تصویریں نظر آتی ہیں۔

سید محمد محمود اکبرآبادی محاورے کی ہمہ گیر اہمیت و افادیت کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

بیان کے اسالیب میں محاورہ سب سے ہمہ گیر، بارآور اور مفید اسلوب ہے۔شکل اور صورت کے اعتبار سے بھی محاورہ زبان کی ایک حسین فنی پیداوار ہے۔

(اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو ،ص :۴۷ ، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

زبان کا رشتہ کسی کلچر یا تہذیب سے وابستہ ہوتا ہے، علاقائی، قومی یا عالمی سطح کی کوئی بھی زبان ہو اس کا اپنا روزمرہ، محاورہ اور ضرب المثل ہی اس کی انفرادی خصوصیت کو اجاگر کرتا ہے۔ ان کے برجستہ اور برمحل استعمال سے جملے اور شعر دونوں کے حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ یہ تہذیب و تمدن کے رجحانات کے عکّاس اور اجتماعی زندگی کے بہترین مرقّع ہوتے ہیں اور ان میں معاشرے کی پوری ذہنیت اور شخصیت رچتی بستی نظر آتی ہے۔ محاورے اور ضرب الامثال رنگین الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ اجتماعی تجربے کا

ذریعہ اظہار ہیں۔ یہ دیکھنے میں جز معلوم ہوتے ہیں لیکن اس جز میں کل پنہاں ہوتا ہے اور اس میں ارتقائے تمدّن کی کہانی پوشیدہ ہوا کرتی ہے۔

## محاورہ کی لغوی واصطلاحی تعریف :

محاورہ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا لغوی معنیٰ ہے: ہم کلامی، باہمی گفتگو، بول چال، بات چیت، آپس میں سوال و جواب کرنا وغیرہ۔ مباحثہ و مکالمہ کے وزن پر باہمی گفتگو کے معنی میں لفظ محاورہ کا صیغہ مضارع قرآن شریف میں بھی آیا ہے۔

( و ھو یحاورہ انا اکثر منک مالا و اعز نفرا )

برج موہن دتا تریہ کیفی کے الفاظ میں محاورے کی اصطلاحی تعریف یہ ہے:

وہ کلام جس کے لفظ اپنے معنیٰ غیر موضوع لہ میں استعمال ہوتے ہوں، محاورہ ہے۔ محاورہ کم سے کم دو کلموں سے مرکب ہوتا ہے۔ محاورہ، قواعد کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اکثر محاوروں کی بنیاد استعارے پر ہوتی ہے، درست نہیں معلوم ہوتا۔ استعارے کی جگہ تمثیل کہا جائے تو مضائقہ نہیں۔

( کیفیہ، ص:۱۳۴، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی )

پنڈت کیفی کی یہ تعریف جامع معلوم نہیں ہوتی۔ البتہ ڈاکٹر یونس اگاسکر کی بیان کردہ تعریف میں بڑی حد تک جامعیت نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

درحقیقت صوری اعتبار سے محاورہ الفاظ کے ایسے مجموعے کو کہتے ہیں جس سے لغوی معنی کے بجائے ایک قرار یافتہ معنیٰ نکلتے ہیں۔محاورہ میں عموماً علامتِ مصدر ''نا'' لگتی ہے۔جیسے آب آب ہونا، دل ٹوٹنا، خوشی سے پھولے نہ سمانا۔محاورہ جب جملے میں استعمال ہوتا ہے تو علامتِ مصدر ''نا'' کی جگہ فعل کی وہ صورت آتی ہے، جو گرامر کے اعتبار سے موزوں ہوتی ہے۔ جیسے: دل ٹوٹ گیا، دل ٹوٹ جاتے ہیں، دل ٹوٹ جائے گا، وغیرہ۔ گویا محاورہ گرامر کی پابندی کرتا ہے۔ اس کے برخلاف روز مرّہ اور کہاوت پابندی سے آزاد ہوتے ہیں۔

(اردو کہاوتیں اور ان کی سماجی و لسانی پہلو، ص:۴۵، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

حالی نے اپنے ''مقدمہ'' میں لکھا ہے: اہلِ زبان کے روز مرّہ بول چال اور اسلوبِ بیان کا نام محاورہ ہے۔ پس ضروری ہے کہ محاورہ تقریباً ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جائے۔ کیوں کہ مفرد الفاظ کو روزمرہ یا بول چال یا اسلوب بیان نہیں کہا جاتا۔ بخلاف لغت کے کہ اس کا اطلاق ہمیشہ مفرد الفاظ پر یا ایسے الفاظ جو بمنزلہ مفرد کے ہے، کیا جاتا ہے۔ مثلاً: پانچ اور سات، دو لفظ ہیں جن پر الگ الگ لغت کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ مگر ان میں سے ہر ایک کو محاورہ نہیں کہا جائے گا، بلکہ دونوں کو ملا کر جب ''پانچ سات'' بولیں، تب محاورہ کہا جائے گا۔ محاورہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ترکیب جس پر محاورہ کا اطلاق کیا جائے، قیاسی نہ ہو، بلکہ معلوم ہو کہ اہل زبان اس کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً: اگر ''پانچ سات یا سات یا آٹھ یا آٹھ سات'' پر قیاس کر کے ''چھے آٹھ، یا آٹھ چھے، یا سات نو'' بولا

جائے گا تو اس کو محاورہ نہیں کہیں گے۔ کیوں کہ اہلِ زبان کبھی اس طرح نہیں بولتے۔ یا مثلاً: بلا ناغہ پر قیاس کر کے اس کی جگہ ’’بے ناغہ‘‘، ہر روز کی جگہ ’’ہر دن‘‘، روز روز کی جگہ ’’دن دن‘‘ یا آئے دن کی جگہ ’’آئے روز‘‘ بولنا، ان میں سے کسی کو محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ کیوں کہ یہ الفاظ اس طرح اہل زبان کی بول چال میں کبھی نہیں آتے۔ کبھی محاورے کا اطلاق خاص کر ان افعال پر کیا جاتا ہے جو کسی اسم کے ساتھ مل کر اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

(مقدّمہ شعر و شاعری، ص:۱۷۳-۱۷۴، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ؛ نئی دہلی)

مذکورہ بالا تعریفات سے ظاہر ہے کہ محاورے میں الفاظ کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ مجازی معنی مراد ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ’’جھاڑو پھیرنا‘‘ کا حقیقی معنیٰ ہے: کسی فرش پر جھاڑو لگانا، مگر مجازی معنی یہ ہے کہ کسی چور نے چوری کی اور ایسی چوری کی کہ گھر کا سارا ساز و سامان لے گیا۔ اب ایسے موقع پر کہا جائے گا کہ ’’چور نے فلاں کے مکان میں جھاڑو پھیر دیا‘‘۔

اسی طرح ایک محاورہ ہے: ’’کان بھرنا‘‘۔ اس کا حقیقی معنی ہے: کان میں کچھ ڈال کر اسے بھر دینا، لیکن محاورہ کے طور پر اس کا مجازی معنیٰ ہے: ’’کسی کو کسی کے خلاف بھڑکانا، متنفر کرنا، بدگمان کرنا‘‘۔

## کلامِ نور میں اردو محاورات کا استعمال :

شاعری کا حسن و دلکشی اس کے فصیح و بلیغ کلام میں مضمر ہے۔ فصیح کلام بالعموم محاوارت وضرب الامثال اور رزومرّوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

زبان، محاورات اور روز مرّوں سے جتنی زیادہ قریب ہوتی ہے، اس میں فصاحت کا عنصر اتنا ہی زیادہ پایا جاتا ہے۔ محاورات کے مناسب استعمال سے نہ صرف یہ کہ کلام کی تزئین وآرائش اور حسن ودلکشی میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے، بلکہ ان کی مدد سے بڑے سے بڑے مفہوم کو چند لفظوں میں بآسانی ادا کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم اساتذۂ سخن کے دواوین و کلیات میں اردو محاوارت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

سید نور صاحب کی شاعری کی پہلی نمایاں خصوصیت اس کی فصاحت و بلاغت ہے۔ وہ اپنے کلامِ بلاغت نظام میں زبان و بیان کے اصول و مبادی کی رعایت کرتے ہوئے اس میں ممکنہ طور پر ظاہری ومعنوی خوبیاں انڈیل دیتے ہیں۔ اردو زبان کے الفاظ ومحاورات پر انہیں فنکارانہ عبور حاصل ہے۔ ان کے پاس الفاظ کا اچھا خاصہ ذخیرہ ہے۔ اردو محاوارت پر انہیں دسترس حاصل ہے۔ ایک مفہوم کو الفاظ وتراکیب اور اسالیبِ بیان میں معمولی ردوبدل کر کے مختلف طریقوں سے بلا تکلف ادا کرنے کے فن سے وہ واقف ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق موصوف کے پانچ مجموعہ کلام میں سے تقریباً تین سو اردو محاورے راقم کی نگاہوں سے گذرے، جو دراصل ان کی زبان دانی اور قادر الکلامی کی ایک مستحکم دلیل ہے۔ کلامِ نور میں اردو محاورات کا استعمال ملاحظہ فرمائیں:

(۱) سر جھکانا: اطاعت وفرماں برداری کرنا، عاجزی ظاہر کرنا، غایت درجہ تعظیم وتوقیر کا معاملہ کرنا، مغلوب کرنا، پچھاڑ دینا

سر جھکا دے ان کے در پر خامۂ تحریر کا
کھول دیتے ہیں مرے سرکار در تقدیر کا

رسولِ پاک کے دربارِ جاہ و عزت میں
سرِ قلم کو جھکائیں تو نعت ہوتی ہے

اے نور! سر پہ ان کی غلامی کا تاج ہے
میں نے جھکا دیے ہیں کئی سر پھروں کے سر

(۲) سوال اٹھانا : اعتراض کرنا، اول فول بکنا

اختیارِ مصطفیٰ پر تم اٹھاتے ہو سوال
کام لے لیتے ہیں آقا شاخ سے شمشیر کا

(۳) مہرباں ہونا : رحم دل ہونا، ترس کھانا، راضی ہونا

مہرباں جس پر ہوئی ہو خاکِ کوئے مصطفیٰ
چوم لوں گا میں ادب سے پاؤں اس رہگیر کا

(۴) دم آنا: جان میں جان آنا، لب پہ نام آنا

آخری دیدار کی خواہش میں آنکھیں ہیں کھُلیں
لب پہ آیا دم مرے آقا ترے نخچیر کا

(۵) دفتر کھلنا : زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان دینا، اعمال کا ظاہر ہونا

مصطفیٰ کا دستِ رحمت بند کرنے آ گیا
جب سرِ محشر گناہوں کا مرے دفتر کھلا

(۶) جی بھرنا : سیر ہونا، اکتا جانا، مزید خواہش کا باقی نہ رہنا

بھرتا کہاں ہے جی درِ سرکار دیکھ کر
بڑھتی ہے اور خواہشِ دیدار، دیکھ کر

(۷) سلام کرنا : آداب بجا لانا، سرِ تسلیم خم کرنا، خیر آباد کہنا، دستبردار ہونا

کرنے لگے ادب سے ستارے مجھے سلام
سر پر غبارِ کوچۂ سرکار دیکھ کر

نوٹ : اس شعر میں سلام کرنے کا محاورہ تعظیم وتوقیر اور آداب بجا لانے کے معنی میں ہے۔

ہر منظرِ جہاں کو کیا آخری سلام
میں نے رسولِ پاک کا دربار دیکھ کر

نوٹ: یہاں سلام کرنے کا محاورہ ''الوادع کہنے اور دستبردار ہونے'' کے معنی میں ہے۔

(۸) پاؤں چومنا : تعظیم کرنا، قدم کو بوسہ دینا

جنت نے بڑھ کے چوم لیے عاصیوں کے پاؤں
محشر میں مصطفیٰ کو طرف دار دیکھ کر

بلندیاں کیوں نہ بڑھ کے خود میرے پاؤں چومیں
پڑی ہوئی ہے مری تمنا درِ نبی پر

(۹) زمین تنگ ہونا : رہنے کے لیے جگہ نہ ملنا، دشواریوں میں مبتلا ہونا

ہو تنگ زمیں ہند کی کچھ غم نہیں مجھ کو
مل جائیں گے آقا کے غلاموں کو مکاں اور

(۱۰) قدموں سے لگا رہنا یا قدموں میں رہنا : نہایت تعظیم وتوقیر کا برتاؤ کرنا، مطیع وفرماں بردار ہونا

ہوں غلام ان کا تو قدموں میں رہوں گا ان کے
آخرش حق کو پہنچ جانا ہے حق دار کے پاس

(۱۱) صلِّ علیٰ کہنا : واہ واہ کرنا، سبحان اللہ کہنا

جب بھی ہونٹوں پہ مہکتا ہے گُلِ نامِ نبی
آسمانوں کے مکیں صلِّ علیٰ کہتے ہیں

(۱۲) ذکر چھڑنا: بات چیت کی ابتدا ہونا، کسی کے ذکر کا موضوع سخن بن جانا

کہیں ذکر چھڑتا ہے جب کربلا کا
تو ہم اپنی آنکھوں کو نم دیکھتے ہیں

(۱۳) آنکھیں ملانا : مقابلہ کرنا، چیلنج کرنا

ان کی گلی کی خاک سے آنکھیں ملا سکے
ایسی چمک کہاں کسی دُرِّ خوش آب میں

(۱۴) لَو لگانا : خیال و تصور باندھنا، ہر وقت دھیان لگانا، آرزو مند ہونا

اے جانِ کائنات ! مری زندگی ہے تو
تجھ سے ہی لَو لگانا مرا کاروبار ہے

(۱۵) حالت غیر ہونا : بری حالت ہونا، بہت پریشان ہونا، بیمار کی حالت کا بگڑنا

کب تک سہے فراقِ مدینہ کا غم حضور
حالت ہے اب تو غیر دلِ نا صبور کا

(۱۶) خاطر میں نہ لانا : خیال نہ کرنا، اہمیت نہ دینا، پرواہ نہ کرنا، عزت نہ دینا

اطراف میرے رحمتِ آقا کا ہے حصار
خاطر میں لاؤں کس طرح برق و شرر کو میں

(۱۷) کلی کھِلنا، کلی چٹکنا : پھول کھلنا، فرحتِ دل اور انبساطِ خاطر کا حاصل ہونا، خوشی ملنا

کلی اے نور دیدِ مصطفیٰ کی
مری شاخِ تمنا پر کھِلی ہے

(۱۸) نام چمکنا : شہرت پانا، مشہور ہونا

عشق کی آنکھیں کھول کے دیکھو جہاں بھی لکھا رہتا ہے
سب نبیوں میں میرے نبی کا نام چمکتا رہتا ہے

(۱۹) گھر بنانا : مکان بنانا، پاؤں جمانا، اطمینان سے بیٹھنا

اے مری آرزو مدینے چل
گھر بنا کوچۂ زیارت میں

(۲۰) سر پہ رکھنا : تعظیم کرنا، مقدس اور قابل تعظیم جاننا، بوجھ اپنے سر لینا

سر پہ رکھتا ہوں خاکِ کوئے نبی
تاج داری ہے میری فطرت میں

(۲۱) ہاتھ بڑھانا : متوجہ ہونا، ہاتھ آگے کرنا

کرم کا ہاتھ بڑھائیں تو نعت ہوتی ہے
مرے حضور جو آئیں تو نعت ہوتی ہے

(۲۲) کلمہ پڑھنا : خدا کا نام لینا، اطاعت و فرماں برداری کرنا، عاشق و شیدا ہونا

ان کا ہی کلمہ پڑھتی ہے دریا کی موج موج
مصروف ذکر میں مہ و اختر انہیں کے ہیں

(۲۳) زبان ہلانا : بات کرنا، اشارہ کرنا، بولنا، مانگنا

جو کہنا خاموشیوں میں کہنا درِ نبی پر
کہ نا روا ہے زباں ہلانا درِ نبی پر

(۲۴) فروغ پانا: عزت پانا، نام کمانا، سربلندی حاصل کرنا
تم سے فروغ پاتے ہیں عرفان و آگہی
اسرارِ ہست و بود سے بھی آشنا ہو تم

(۲۵) سکہ چلنا : رعب و دبدبہ قائم ہونا، حکم چلنا
اے ابرِ کرم ، شمعِ حرم ، جانِ دوعالم
سکّہ نہ چلا اور کسی کا ترے آگے

(۲۶) پسینہ آنا : عرق آنا، شرمندہ ہونا، لاجواب ہونا
کیا منصبِ عالی ہے ترا کس کو پتہ ہے
گردوں کو بھی آتا ہے پسینہ ترے آگے

(۲۷) آئینہ دکھانا : عیب و ہنر ظاہر کرنا، اوقات بتانا
گلشنِ زہرا کے کھِلتے ہوئے غنچے نکلے
باغِ فردوس کو آئینہ دکھاتے نکلے

(۲۸) ہوا ہونا : کافور ہونا، دور ہونا، فنا و نابود ہونا
جاری جو لب پہ نامِ شہِ دوسرا ہوا
دونوں جہاں کا غم مرے دل سے ہَوا ہُوا
جب نگاہِ لطف اٹھ گئی ، جب کرم کا فیصلہ ہوا
ہر فصیلِ فکر گر گئی ، ہر خیالِ غم ہَوا ہُوا

(۲۹) ٹوٹنا یا ٹوٹ پڑنا : اچانک حملہ کرنا، قربان ہونا، جاں نثار ہونا، انتہائی شوق ظاہر کرنا

ٹوٹتے تھے لوگ ان پر ہر جگہ پروانہ وار
شمعِ حق تھی زندگانی حضرتِ نوّاب کی

نوٹ : یہاں ’’ٹوٹنے یا ٹوٹ پڑنے‘‘ کا محاورہ ’’قربان و جاں نثار ہونے‘‘ کے معنیٰ میں ہے۔

(۳۰) بلائیں لینا : واری جانا، صدقے جانا، قربان ہونا، پیار کرنا

ان کے دیوانوں کی لیتا ہوں بَلائیں اے نور
ان کے دشمن کے لیے تیغ و تبر رکھتا ہوں

(۳۱) گیت گانا : تعریف و توصیف کرنا

خاموش ہیں فضائیں ، ہوا بھی اداس ہے
گیت ان کی چاہتوں کے ذرا گنگنا کے دیکھ

(۳۲) خاک میں مِلنا : دفن ہونا، تلف و ضائع ہونا، نیست و نابود ہونا

معراج تری ہے مرے ادراک سے باہر
معراج مری، خاک میں مِلنا ترے آگے

(۳۳) سرخرو ہونا : کامیاب و کامراں ہونا، عزت حاصل کرنا

سرخرو ہوگا ملائک کی دعاؤں سے وہی
جس کے لب پر شہِ کونین کا چرچا ہوگا

(۳۴) پگڑی اچھالنا : بے عزت کرنا، ذلیل و رسوا کرنا، ہنسی اڑانا

رسولِ ہر دو جہاں کی رحمت فصیل بن کر کھڑی ہوئی ہے
وگر نہ دنیا تو چاہتی تھی ہماری پگڑی اچھال دینا

(۳۵) قدم لڑکھڑانا : ہمت ہار جانا، مقابلے میں سامنے ٹک نہ پانا

شیرِ خدا کے شیر جب آئے ہیں سامنے
باطل کے فوجیوں کے قدم لڑکھڑائے ہیں

(۳۶) خون کے آنسو بہانا : نہایت رنج و غم کا اظہار کرنا

آنچل فلک کا خونیں ہے غم میں حسین کے
ظاہر ہے اس نے خون کے آنسو بہائے ہیں

(۳۷) دم ٹوٹنا : سانس پھولنا یا سانس اکھڑنا، حالت نزع میں ہونا، جان نکلنا

حسرت ہے دمِ نزع تو آنکھوں میں بسا ہوا
دم ٹوٹے مرا جانِ مسیحا ترے آگے

(۳۸) آنکھیں بھگونا : رونا، آب دیدہ ہونا

اہلِ دل سے بات یہ پوچھو وہ ہی بتائیں گے تم کو
ہجر میں ان کے آنکھیں بھگونا کتنا اچھا رہتا ہے

(۳۹) ہنسنا : مسکرانا، خوش ہونا، ہنسی اڑانا، تضحیک کرنا

مہرِ فلک پہ ہنسنے لگا میرا شہرِ دل
روشن ہوا جو نقشِ تمنا حضور کا

نوٹ: یہاں ''ہنسنا'' کا محاورہ تمسخر و تضحیک اور ہنسی اڑانے کے معنیٰ میں ہے۔

(۴۰) قد ناپنا : مقام و مرتبہ اور حیثیت کا اندازہ لگانا

مرے رسول کا قد ناپنے جو اٹھا تھا
حریفِ عقل و خرد تھا، ذلیل و خوار ہوا

(۴۱) خاک چھاننا : خوب تلاش کرنا، آوارہ و سرگرداں پھرنا

تارے بھی غبارِ طیبہ اوڑھیں
مہتاب بھی خاک چھانتا ہے

(۴۲) پانی پانی ہونا : نادم وشرمندہ ہونا

بہت مسرور تھا مہتاب اپنی ضوفشانی پر
ترے تلوؤں کے آگے میرے آقا پانی پانی ہے

## کلامِ نور میں صنائع وبدائع کی جلوہ ریزیاں :

صنائع وبدائع کو سمجھنے سے پہلے ''علمِ بدیع'' کی معرفت ضروری ہے، کیوں کہ ان دونوں کا تعلق اسی علم سے ہے۔ صنائع لفظی ومعنوی کی معرفت کے لیے ہی ''علمِ بدیع'' کی بنیاد پڑی۔ بدیع کا معنیٰ ہے: نیا، نادر یا انوکھا۔ شعروادب کی اصطلاح میں بدیع سے مراد وہ علم ہے، جس سے کلام کے الفاظ و معانی میں زیب وزینت اور حسن ودلکشی پیدا کرنے کا ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ یعنی یہ علم، کلام کی لفظی ومعنوی خوبیاں ظاہر کرتا ہے۔ الفاظ میں قوّت وتوانائی اور جوہری خزانے ہوتے ہیں۔ ان میں تصوّرات اور پس منظر ہوتے ہیں جو اپنے اندر تلمیحات واشارات لئے ہوتے ہیں اور بقول مرزا غالب ہر لفظ ایک ''گنجینہ معنیٰ'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ بعض اوقات الفاظ ذہن وفکر کو ایک خاص ماحول اور ایک مخصوص فضا میں پہنچا دیتا ہے اور جب انہیں الفاظ کو شاعر بحر، ردیف اور قافیہ کے سانچے میں ڈھالتا ہے تو ان میں جوش وولولہ اور اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر ضرورت ہے کہ شاعر الفاظ کے انتخاب میں ماہر ومشّاق ہو۔ جس قدر اعلیٰ درجے کا شاعر ہوگا، اس کے یہاں اسی قدر اعلیٰ درجے کی ''صنائع و

بدائع‘‘ ہوں گی۔الفاظ کا برمحل اور موزوں انتخاب اور صنائع و بدائع کا مناسب استعمال شعر کے حسن و دلکشی میں چار چاند لگا دیتا ہے۔

مولوی نجم الغنی رام پوری نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ’’بحر الفصاحت‘‘ میں خیر البلاغت کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

کلام میں دو قسم کا حسن ہوتا ہے۔(۱)حسنِ ذاتی (۲)حسنِ عارضی

ذاتی حسن: کلام کا ذاتی حسن یہ ہے کہ اس کے بغیر کلام صحیح نہ ہو اور (لوگ) اس کو پسند نہ کریں اور یہ بات علم معانی سے معلوم ہوتی ہے۔

عارضی حسن: کلام کا عارضی حسن یہ ہے کہ اس سے کلامِ فصیح و بلیغ کی رونق بڑھ جائے۔ یہ تین طرح پر ہے۔

(یعنی کلام کے عارضی حسن کی تین قسمیں ہیں)

(۱)لطافت (۲) رعایتِ نسبت (۳)صناعت

لطافت یہ ہے کہ کلام سے سوائے معنی مراد کے دوسرے معنی لطیفے کے طور پر نکلتے ہوں۔

رعایتِ نسبت یہ ہے کہ متکلم جس چیز کا بیان شروع کرے، اول سے آخر تک اس کی رعایت ملحوظ رکھے اور مناسبات کو جمع کرتا رہے۔

صناعت یہ ہے کہ اسے ماہرانِ سخن آرائشِ کلام کے لئے اختیار کرتے ہیں اور علم بدیع میں اس کا حال (مراد صنائع و بدائع یا صنائع لفظی و معنوی ہے) مفصّل مذکور ہوتا ہے۔(بحر الفصاحت مکمل،ص:۳۵۴-۳۸۵ ،راجہ رام کمار بک ڈپو،لکھنؤ)

صنائع:- صنائع ،صنعت کی جمع ہے۔علمِ بلاغت کی اصطلاح میں کلام کی وہ خوبیاں جو صوری و معنوی اعتبار سے کلام کے حسن و دلکشی میں

اضافہ کرے ''صنائع'' کہلاتی ہیں۔

بدائع : اصطلاحِ ادب میں ''بدائع'' سے مراد کلام کی وہ خوبیاں ہیں جن کے ذریعے شعر کے معنوی محاسن واوصاف ظاہر ہوں۔

(تفہیم البلاغت، ص:۲۵، مکتبہ فریدی اردو کالج، کراچی)

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوا کہ کلام میں ''صنائع و بدائع'' کا فنکارانہ استعمال تزئینِ اشعار اور حسنِ کلام کے لیے ہوتا ہے اور ان کی آمیزش سے فصیح و بلیغ کلام کی رونق اور دلکشی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

اب آیئے اور کلامِ نور میں صنائع و بدائع کی جلوہ آرائیاں ملاحظہ کیجیے۔

## صنعتِ تلمیح :

بحر الفصاحت، جلد دوم، ص۱۴۶۴، مطبوعہ: قومی کونسل، دہلی میں مذکور ہے:

یہ صنعت اس طرح ہے کہ شاعر اپنے کلام میں کسی مسئلہ مشہورہ یا کسی قصّے یا مَثَلِ شائع یا اصطلاح نجوم وغیرہ یا کسی ایسی بات کی طرف اشارہ کرے جس کے بغیر معلوم ہوئے اور بے سمجھے اس کلام کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آئے۔ اس صنعت کا استعمال اردو شاعری میں خوب ہوا ہے۔

## تلمیحاتِ نور :

سید نور صاحب کے کلام میں اس صنعت کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ یہاں تک کہ اس موضوع پر ''تلمیحاتِ نور'' کے نام سے ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

حکم سورج کو دیا تو وہ بھی آیا لوٹ کر
چاند دو ٹکڑے تو ہو جا ، کہہ دیا تو ہو گیا
میرے آقا آپ کا فرمان کیا فرمان ہے !!
آپ نے کعبے کو قبلہ کہہ دیا تو ہو گیا
کتنی محبوب رہی ہوگی نبی کی تعظیم
یوں ہی حیدر نے کہاں عصر کو چھوڑا ہوگا
آواز آ رہی تھی صلات و سلام کی
شاہد علی ہیں گزرے وہ جب کوہسار سے
کونین کے مالک ہیں ، چٹائی ہے بچھونا
سرکار کے جیسی کوئی سرکار نہیں ہے
مجرم کو اپنے تیری عدالت میں بھیج کر
واضح کیا خدا نے ترے اختیار کو
وہ ہوں گے سجدے میں امت کی مغفرت کے لیے
پھر اس کے بعد نبی مسکرا رہے ہوں گے
اسلام تیرے شہر کی سج دھج میں بس گئی
ابنِ علی کے خونِ شہادت کی روشنی
بس پلک جھپکی ، سفر طے ہوگیا معراج کا
وقت بھی تمثیل سے عاجز ہے اس رفتار کی
پائے نازِ مصطفیٰ میں کیا عجب تاثیر ہے
لے کے بوسہ موم ہو جاتے ہیں پتھر دیکھیے

مرحب و عنتر کے جیسے ٹک نہ پائے سامنے
قوتِ شیرِ خدا ، بازوئے حیدر دیکھیے

☆☆☆

## صنعتِ تلمیع :

صنعت تلمیع کی ابتدائی مثالیں فارسی میں ملتی ہیں۔ جب عربی تراکیب فارسی شاعری کا حصہ بننے لگیں تو اس عمل کو تلمیع سے تعبیر کیا گیا۔ مولوی نجم الغنی رامپوری نے ''بحر الفصاحت میں لکھا ہے کہ: ''صنعتِ تلمیع یا ملمّع اس طرح پر ہے کہ کلام میں زبان ہائے مختلف کو جمع کر دیں۔لہٰذا'' تلمیع''، شعر وسخن کی وہ صورت قرار پاتی ہے، جس میں ایک مصرع کے دو حصّے دو مختلف زبانوں پر مشتمل ہوں یا ایک شعر کے دو مصرعے یا ایک بند کے مختلف مصرعے یا اشعار میں مختلف زبانیں جمع کر دی جائیں۔ یعنی کسی مصرعے کا نصف اوّل ایک زبان میں اور نصفِ آخر دوسری زبان میں ہو۔

اس صنعت کو'' ذولسانین'' اور'' ذولغتین'' بھی کہتے ہیں۔ یہ (صنعتِ ملمّع )صنعتِ اقتباس سے ملتی جلتی صنعت ہے۔

**مثالیں :**

یا صاحب الجمال و یا سید البشر
من وجہک المنیر لقد نور القمر

لا یمکن الثناء کما کان حقہ
’’ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر‘‘

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے منسوب اس قطعہ میں پہلے تین اشعار عربی زبان میں ہے اور آخری مصرع ’’بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر‘‘ فارسی میں ہے۔

مرزا غالب کے پورے دیوان میں صرف ایک جگہ اس صنعت کا استعمال ہوا ہے۔

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
’’و قنا ربنا عذاب النار‘‘

امام احمد رضا خان محدث بریلوی کے دیوان ’’حدائقِ بخشش‘‘ میں ایسے اشعار کی تعداد کثیر ہے۔ مثلاً:

’’ثانِیِ اثنین اذھما فی الغار‘‘
میں نثار اور فدا محبِّ رسول

(رضا بریلوی)

کلامِ نور میں صرف دو جگہ مجھے یہ صنعت نظر آئی۔ بہت ممکن ہے ان کے دیگر مجموعوں میں اس کی مزید کچھ مثالیں مل جائیں۔

’’ یا صاحب الجمال و یا سید البشر‘‘
مانگا کروں گا تجھ کو خدا سے دعاؤں میں
عالی صفات ، عمدہ سِیَر ، ارفع النظر
ماہِ صفات ، مہرِ فضائل ، کمال ور

اے یارِ غارِ مصطفیٰ ، صدیقِ با صفا
'' بعد از نبی بزرگ توئی قصہ مختصر''

## صنعتِ مراعات النظیر :

اصطلاحِ بلاغت میں مراعات النظیر یہ ہے کہ کلام میں چند ایسی چیزیں مندرج ہوں جو آپس میں مناسبت رکھتی ہوں۔ جیسے: باغ اور گلشن کے ذکر کے ساتھ گل، نسرین، نرگس اور بلبل وغیرہ کا ذکر یا فلک کے ذکر کے ساتھ چاند، سورج اور ستاروں کا ذکر وغیرہ۔

(ترجمہ حدائق البلاغت، ص:۷۰)

دولہا سے اتنا کہہ دو پیارے سواری روکو
مشکل میں ہے براتی ، پر خار وادیے ہیں

(رضا بریلوی)

سید نور صاحب کے کلام میں صنعتِ تلمیح و صنعتِ اقتباس کی طرح ''صنعتِ مراعات النظیر'' بھی کثرت سے پائی جاتی ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار سپردِ قرطاس کرتا ہوں۔

کوئی بھی موج الجھتی نہ میری کشتی سے
جو نامِ سیدِ کونین نا خدا ہوتا
سیراب کر رہا ہے دلوں کی جو کھیتیاں
کرتا ہوں میں تلاش اسی آبشار کو
بھیک اس کو کہیں بھی مل نہ سکی
ان کی چوکھٹ کا جو گدا نہ ہوا

اذن کا دریا جاری کر دو ، بھیج دو مجھ کو منظوری
میرے آقا اپنے لبوں کو کب تک پیاسا دیکھوں گا
لپٹ سے جس کی جھلس رہا ہے فلک کا سینہ
وہ آگ یکسر بجھانے والا مرا خدا ہے
اے دردِ لا دوا تجھے شاید خبر نہیں
بیمار اب پہنچ گیا دار الشفاء کے پاس
بحرِ زندگانی میں ہر طرف تلاطم ہیں
اب تو نور کا بیڑا آپ ہی بچائیں گے
لہو تازہ ٹپکتا ہے ابھی تک زخمِ باطل سے
یہی تو کاٹ ہے صبر و رضا کے تیز خنجر کی
اٹھے طوفانِ غم یا آندھیاں آلام کی آئیں
رہے شمعِ محبت دل میں روشن ابنِ حیدر کی
تمہارے جود و کرم کے بادل، برس پڑیں جو ادھر بھی آقا
خزاں رسیدہ چمن ہمارا بس آنِ واحد میں لہلہائے

مندرجہ بالا اشعار میں موج، کشتی، ناخدا، آبشار، کھیتیاں، سیراب، گدا، چوکھٹ، بھیک، دریا، جاری، پیاسا، آگ، لپٹ، جھلسنا، درد، بیمار، دار الشفاء، خنجر، کاٹ، لہو، بحر، تلاطم، بیڑا، طوفان، شمع، روشن، بادل، چمن، لہلہانا۔ یہ سارے الفاظ ایسے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے موافق و مناسب ہیں۔

## صنعتِ تضاد :

اس صنعت کو ’’طباق یا تطبیق‘‘ بھی کہتے ہیں۔ اصلاح شعر میں ایسے الفاظ کا استعمال ایک ساتھ کرنا جن میں معنیٰ کے اعتبار سے تضاد پایا جائے۔ یہ تضاد (ایک دوسرے کی ضد) اسم، فعل، حرف یا دوسرے اجزاء سے کلام کے مابین ہوسکتا ہے۔ (مفتاحِ سخن، ص:۶۲)

یعنی شعر میں ایسے دو یا چند الفاظ جمع کرنا جو وصف اور معنی میں ایک دوسرے کے خلاف (ضد) ہو۔

چچا غالب کا شعر ہے :

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

اس شعر میں فرش وعرش اور زمین وآسمان متضاد الفاظ ہیں۔

کفر و خرد کو راس نہ آئے گی زندگی
جب تک جنوں ہے مشعلِ ایماں لیے ہوئے

یہاں کفر وایمان اور جنوں وخرد متضاد الفاظ ہیں۔

کلامِ نور میں ’’صنعتِ تضاد‘‘ پر مشتمل اشعار سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ نموتاً کچھ اشعار نذرِ قارئین ہیں:

علیٰ الدّوام وجود و قیام ہے اس کا
نہ ابتدا ، نہ کوئی اختتام ہے اس کا

شرق سے غرب تلک اور زمیں سے تا عرش
جو بھی موجود ہے سب کچھ تو ہے مولیٰ تیرا

تمہارا ذکر خشک وتر میں بھی ہے، بحر و بر میں بھی
تمہاری مدح خوانی درمیانِ مور و ماہی ہے
یارب تری رضا رہے مدّ ِ نظر سدا
مجھ کو نہ فکرِ سود ، نہ فکرِ زیاں رہے

ان اشعار میں ابتدا واختتام، شرق وغرب، بحر و بر، خشک وتر اور سود و زیاں متضاد الفاظ ہیں، جن کے معانی میں تضاد ہے۔

## صنعتِ اقتباس :

شاعری میں صنعتِ اقتباس سے مراد یہ ہے کہ شاعر اپنے شعر میں قرآن پاک یا حدیث مبارکہ میں سے کچھ الفاظ حوالے کے لیے استعمال کرے۔ اس صنعت کو کلام میں برتنے کے لیے بڑی مہارت اور احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔

مثالیں :

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
''و قنا ربنا عذاب النار''

(مرزا غالب)

رنگِ ''او ادنیٰ'' میں رنگیں ہو کے اے ذوقِ طلب
کوئی کہتا تھا کہ لطف'' ما خلقنا '' اور ہے

(علامہ اقبال)

'' ورفعنا لک ذکرک'' کا ہے سایہ تجھ پر
بول بالا ہے ترا ، ذکر ہے اونچا تیرا

"من رانی قد رای الحق" جو کہے
کیا بیاں اس کی حقیقت کیجئے

(رضا بریلوی)

## اقتباساتِ نور :

جناب سید نور صاحب کے کلام میں صنعتِ اقتباس کی کثیر مثالیں موجود ہیں۔

جب جب بھی نور کہتا رہا" اھدنا الصّراط"
آنکھوں میں تیرا نقشِ کفِ پا بسا رہا
آ رہی تھیں " اُدنُ منّی " کی صدائیں بار بار
قرب بڑھتا جا رہا تھا کس قدر مابین کا
پہنچے جب آغوشِ " او ادنیٰ " میں محبوبِ خدا
ختم سارا ہو چکا تھا فاصلہ قوسین کا
روک پائیں کیا اسے ظلم و جفا کی آندھیاں
دیکھ" واسجد و اقترب" کا آئنہ سجدے میں ہے
عظمتِ قرآن و اہلِ بیت پر شاہد رسول
قول ہے " انّی ترکتُ فیکم الثقلین " کا
" لا اقسم " فرما کے خدا نے یہ بتایا
محبوب کے رہنے سے نگر اچھا لگے ہے
بہ فیضِ" علّم القرآن " وہ امّی لقب آقا
کسی سے کچھ نہ پڑھ کر دونوں عالم کو پڑھاتے ہیں

"ولا تقولوا لمن یقتل" سے ثابت ہے
کہ تا ابد ہے حیاتِ شہید کیا کہنا
برسرِ بزم لبوں پر ہے "سلونی" رقصاں
آپ ہی سوچیے علمِ علی کیسا ہوگا
کربلا کی ریت پر ایسا گُلِ "وانحر" کھِلا
جس کے آگے ہر چمن زارِ رضا سجدے میں ہے
اے دل کی دھڑکنو، رہے "ان تحبطَ" کا خوف
ہو جاؤ ہوشیار مدینہ شریف ہے
ان کی ہے ذات ہے تخلیقِ دوعالم کا سبب
ان کو ہی صاحبِ "لو لاک لما" کہتے ہیں

☆☆☆

## حسنِ مطلع :

جس غزل، قصیدہ یا نعت وغیرہ میں پہلے شعر کے بعد دوسرے شعر کے دونوں مصرعوں میں ردیف و قافیہ ہوں، اس کو "حسنِ مطلع" کہتے ہیں۔ کلام کے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں ردیف و قافیہ کا التزام ضروری ہے۔ لیکن دوسرے شعر میں یہ بات ضروری نہیں۔ تاہم شاعر بعض اوقات مطلع کے بعد دوسرے اور تیسرے شعر میں بھی ردیف اور قافیے کا استعمال کر لیتا ہے اور اس کا شمار چوں کہ ادب اور فن کی خوبی میں ہوتا ہے، اس لیے اسے "حسنِ مطلع" کہتے ہیں۔ اردو کے مائۂ ناز شعراء مثلاً: غالب، سودا، میر، جگر اور اصغر وغیرہ کے کلام میں "حسن مطلع" کی کثیر مثالیں موجود ہیں۔

غالب کی غزل کے یہ دونوں شعر مطلع و حسنِ مطلع پر مشتمل ہیں۔

آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں
ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

راقم کی نظروں سے جناب نور کے دسیوں ایسے کلام گذرے، جن میں ''حسنِ مطلع'' کا حسن چشمِ احساس و وجدان کو خیرہ کرتا ہے۔ مطلع و حسن مطلع سے متعلق یہ اشعار ملاحظہ کریں:

نہ ہو گر نطق میں شامل کرم خلّاقِ اکبر کا
ادا اک حرف ہو سکتا نہیں نعتِ پیمبر کا
ملا صدقہ صبا کو نکہتِ زلفِ معنبر کا
تو سینہ خوشبوؤں سے بھر گیا ہر اک گُلِ تر کا

ستارا اوج پر میرے مقدر کا نہیں ہوتا
اگر میں سرورِ کونین کا منگتا نہیں ہوتا
مجھے کچھ خوبیِ تقدیر کا دعویٰ نہیں ہوتا
جو سر پہ آپ کے نعلین کا طغریٰ نہیں ہوتا

قافلہ سوئے مدینہ جو روانہ ہوگا
ہم سے مت پوچھئے کیا حال ہمارا ہوگا
عالمِ جذب میں اک حشر سا گزرا ہوگا
حسرتِ دید میں جب دل مرا تڑپا ہوگا

☆☆☆

## صنعتِ لفّ ونشر مرتّب :

لغت میں لف کے معنیٰ لپیٹنے اور نشر کے معنیٰ پراگندہ کرنے اور پھیلانے کے ہیں اور اصطلاح میں وہ ہے کہ پہلے کئی چیزیں ذکر کر دی جائیں اور اس کے بعد ہر ایک کے متعلقات ومنسوبات تعیین کے بغیر ترتیب وار بیان کر دیے جائیں۔

(ترجمہ حدائق البلاغت، ص:۷۴)

اگر مذکورہ تعریف کے عین مطابق پہلے چند چیزیں بیان کر دی جائیں اور اس کے بعد ہر ایک کے متعلقات ومنسوبات بالترتیب بیان نہ کیے جائیں تو اسے ''لفّ ونشر غیر مرتّب'' کہتے ہیں۔

قرآن مقدس کی سورہ قصص میں ''لف ونشر مرتّب'' کی مثال یوں مذکور ہے: (**ومن رحمته جعل لکم الیل و النهار لتسکنوا فیه و لتبتغوا من فضله ولعلکم تشکرون**)

ترجمہ: اور اللہ کی رحمت میں سے یہ (بھی) ہے کہ اس نے تمہارے رات اور دن بنائے، تاکہ (رات میں) سکون وآرام حاصل کرو اور (دن میں) اس کا فضل یعنی رزق تلاش کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔

دندان ولب و زلف و رُخِ شہ کے فدائی
ہیں دُرِّ عدن لعل یمن مشک ختن پھول

(رضا بریلوی)

اس شعر کے پہلے مصرع میں چار چیزوں دندان، لب، زلف اور رخ کا ذکر ہوا ہے۔ پھر اس کے بعد دوسرے مصرع میں تعیین کے بغیر ہر ایک کے

مناسبات یعنی درّ عدن، لعلِ یمن، مشکِ ختن اور پھول ذکر کیے گئے ہیں۔

جناب سید نور صاحب کے کلام میں ''لف ونشر مرتّب و غیر مرتب '' کی صنعت نہیں کے برابر ہے۔ تلاشِ بسیار کے بعد مجھے لف ونشر مرتّب کی صرف مندرجہ ذیل دو مثال نظر آئی۔

جہاں میں نام ہے روشن نبی کے چار یاروں سے
صداقت کا ، عدالت کا ، سخاوت کا ، شجاعت کا

یہاں پہلے مصرعے میں ''چار یار'' کا ذکر کیا گیا، جس سے بالعموم علیٰ الترتیب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں اصحاب حضرت ابو بکر صدیق ، حضرت عمر فاروق اعظم ، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم مراد لیے جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد دوسرے مصرعے میں ہر ایک کا مشہور وصف یعنی صداقت ، عدالت ، سخاوت اور شجاعت کا ذکر بالترتیب کیا گیا۔ یہی لف ونشر مرتّب ہے۔

لا کر تصوّرات میں زلف و رخِ رسول
واللیل و والضّحیٰ کی تلاوت کریں گے ہم

پہلے مصرع میں زلف اور رخ کا ذکر ہوا اور دوسرے مصرعے میں زلف کی مناسبت سے واللیل اور رخ کی مناسبت سے والضحیٰ ، لف ونشر مرتّب کے طور پر ترتیب وار بیان ہوا۔

## صنعتِ اشتقاق :

کلام میں ایک ہی اصل کے چند الفاظ ایسے لانا کہ ان کے حروف میں ترتیب اور معنیٰ میں موافقت پائی جائے۔

غالب کا شعر ہے:

اصلِ شہود ، شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

(تفہیم البلاغت، ص:۹۴)

کیوں کسی کے ٹکڑوں سے آشنا کریں منہ کو
آپ ہی کا کھاتے ہیں، آپ ہی کا کھائیں گے

کھاتے ہیں اور کھائیں گے، ایک ہی اصل (کھانا) کے دو مختلف صیغے ہیں اور دونوں کے معنی میں اتحاد و موافقت ہے۔

## صنعتِ تنسیق الصفات :

صنعتِ تنسیق الصفات یہ ہے کہ کلام میں ایک موصوف کے کئی اوصاف متواتر ذکر کر دیں۔ جیسے ذوق کے اس شعر میں:

وہ نکو خو و نکو رو و خجستہ منظر
وہ بلند اختر و فرخ روش و فرخ فال

(تذکرۃ البلاغت، ص:۲۳۵)

صنعتِ تنسیق الصفات پر مشتمل نور صاحب کے یہ اشعار دیکھیں کہ پہلے شعر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے متواتر تین صفات، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے پے در پے آٹھ صفات، حضرت مخدوم صابر کلیری اور سرکار سیدی نواب علی شاہ علیہما الرحمہ کے حق میں تین تین صفات متواتر بیان کیئے گئے ہیں۔

اے ابرِ کرم ، شمعِ حرم ، جانِ دوعالم
سکہ نہ چلا اور کسی کا ترے آ گے
عالی صفات ، عمدہ سِیَر ، ارفع النظر
ماہِ صفات ، مہرِ فضائل ، کمال ور
اے یارِ غارِ مصطفیٰ ، صدیقِ با صفا
" بعد از نبی بزرگ توئی قصہ مختصر"
قلزمِ فضل و شرف ، مہرِ سپہرِ معرفت
صبر کے کوہِ گراں مخدوم صابر کلیری
اخلاص ، کمال ، فضل و دانش مندی
موصوف بہ ہر صفت ہیں شاہِ نوّاب

☆☆☆

## صنعتِ حسنِ تعلیل :

صنعتِ حسنِ تعلیل اس کو کہتے ہیں کہ کسی شے کے واسطے کسی شے کو علت ٹھہرائیں اور وہ شے حقیقت میں اس کی علت نہ ہو۔
(ترجمہ حدائق البلاغت، ص:۸۱، مطبوعہ منشی نول کشور، لکھنؤ)

میں چمن میں کیا گیا ، گویا دبستاں کھُل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

(مرزا غالب)

یہاں شاعر نے اپنے دل کی آہ اور نالے کو بلبل کے غزل خواں ہونے کی علت بیان کی ہے، جو حقیقت میں ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک قسم کا

شاعرانہ خیال ہے۔

شبِ غم کی تیرگی میں مری آہ کے شرارے
کبھی بن گئے ہیں آنسو، کبھی بن گئے ہیں تارے

آہ کے شراروں کو ستارے کی تخلیق کا سبب و علت ٹھہرانا، حقیقی نہیں ہے۔

اس قدر شاق ہے جدائی تری
تجھ سے سایہ ترا جدا نہ ہوا

نبی دھرتی پہ آئے ہیں سو کہسار
ادب سے ساکت و جامد کھڑے ہیں

ہواؤں کے پرے جو پھر رہے ہیں
مرے آقا کی خوشبو ڈھونڈتے ہیں

دن نامِ نبی سن کے سفر کا کرے آغاز
شاید یہی مقصد ہے اذانِ سحری کا

تمہارے رخ کی زیارت کو دن نکلتا ہے
طواف گیسوئے اطہر کا آ کے رات کرے

غازۂ خاکِ درِ پاک جو مل جائے مجھے
شبِ تاریک میں عنوانِ سحر ہو جاؤں

## کلامِ نور میں قرآنی افکار کی ترجمانی :

ادبیاتِ عالم کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جتنے بھی بڑے بڑے کلاسیکی شعرا و ادبا گذرے ہوئے ہیں، ان کا تعلق کسی نہ کسی خاص مذہب سے ضرور رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مذہبی تعلیمات پر ان کا عمل رہا یا نہیں رہا، تا

ہم مذہب کی صداقتوں اور اس کی ہمہ گیر سچائیوں کو وہ تسلیم ضرور کرتے ہیں۔ ہندو پاک سمیت دیگر ممالک جہاں اردو زبان وادب کے چرچے عام ہیں، وہاں بھی یہی حال رہا ہے۔ انسان ماحول کا پروردہ ہوتا ہے اور جس ماحول میں اس کی نشو ونما ہوتی ہے، اس کا اثر وہ ضرور قبول کرتا ہے۔ یہاں تک کہ رہن سہن، طور طریقے، انفرادی و اجتماعی معاملات اور طرزِ معاشرت میں ماحول کی تربیت کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسی طرح قدیم ادب کا جو بھی سرمایہ موجود ہے ان سب کا تعلق مذہب سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کی ادبیت اور آفاقیت مسلّم ہے۔

جس طرح دیگر کلاسیکی ادیبوں اور شاعروں نے اپنے کلام میں جدت وندرت، بلاغت وفصاحت اور کشش پیدا کرنے کے لیے اپنے مذہبی خیالات اور مذہبی کتابوں کا سہارا لیا، اسی طرح اردو زبان کے ادبا وشعرا نے اپنے افکار و خیالات کو پیش کرتے وقت مذہبی تعلیمات کو اپنایا اور بیشتر اردو ادبا چوں کہ مسلمان ہوئے ہیں، اس لیے انہوں نے قرآن مقدس کو اپنا رہنما بنایا اور اگر مذہب سے ان کا تعلق گہرا رہا تو اپنے فکر وفن کے اظہار میں انہوں نے قرآنی تعلیمات کو خصوصی اہمیت دی۔ اس کی ایک زندہ مثال ڈاکٹر اقبال ہے۔ اردو شاعری میں نعت وحمد اور منقبت جیسی پاکیزہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرنے والے شعرا نے قرآنی افکار کی ترجمانی کی طرف خصوصی توجہ دی۔ کیوں کہ ان اصناف کے موضوعات کا تعلق براہِ راست دین اسلام اور اس سے وابستہ عظیم ترین مقدس ہستیوں سے ہے۔ اردو نعت گوئی کے وہ ممتاز شعرا جنہوں نے قرآن پاک کو اپنایا اور قرآن پاک کے اعجازی پہلوؤں کو بغور دیکھا، سمجھا اور محسوس کیا، جناب سید نورالحسن نور صاحب ان میں سے ایک ہیں۔ انہوں

نے اپنے غور وفکر کا محور کلامِ الٰہی کو بنایا۔ اس کی تعلیمات کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کر کے اپنی عملی زندگی میں انہیں نافذ کیا، جس کا خوش گوار اثر یہ ہوا کہ ان کے فکر وفن میں بھی قرآنی تصورات ونظریات کا حسین عکس دکھائی دینے لگا۔ اس حقیقت سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے کہ جو کلام رہتی دنیا تک پورے عالمِ انسانیت کے لیے رشد وہدایت اور فوز وفلاح کا ذریعہ ہو، جب اس کے ہمہ گیر افکار ونظریات اور حیات بخش تعلیمات و ہدایات کو اپنے کلام میں شامل کرلیا جائے، تو وہ بھی ابدی اور آفاقی ہو جاتا ہے۔

سید نورالحسن صاحب اردو نعتیہ شاعری کے وہ گوہرِ آب دار ہیں جن کی چمک دمک نے نئی نسل کی نمائندگی کرنے والے فنکاروں کو کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ ان کے فکر وفن کا لوہا ماننے والے ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ خود راقم الحروف نے ان کی شاعری سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ فن کو سلیقے سے برتنے اور اس کے مالہ وما علیہ پر گہری نظر رکھنے والے اس فنکار نے نعتیہ شاعری کو ایک نیا رخ دیا ہے اور اس کے موضوعات واسالیب میں نت نئے اضافے کئے ہیں۔ ان کی شاعری کے بنیادی ماخذ قرآن وحدیث اور صوفیانہ تعلیمات ونظریات ہیں اور ان کے کلام میں سوز وگداز، تڑپ، کشش اور عشق ووفا کے جو گہرے نقوش ہیں، یہ سب اسی وادیِ ایمن کی شرر باریاں ہیں۔

''کلامِ نور میں قرآنی افکار کی ترجمانی'' کے ضمن میں توحید ورسالت اور اس کے متعلقات پر مختلف انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً: وحدانیت کا اثبات، شرک کی نفی، صفات باری تعالیٰ کے وجود وثبوت کا تذکرہ، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت وحاکمیت کا اعلان اور اس قسم کے دیگر توحیدی امور بڑے دلنشیں انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔

## توحیدِ باری تعالیٰ :

اللہ تعالیٰ ایک ہے۔ پاک اور بے عیب ہے۔ وہ اپنی ذات وصفات میں ارفع و اعلیٰ ہے۔ اس کی صفاتِ کاملہ ذاتی و حقیقی ہیں، جن کے لئے فنا نہیں۔قرآن مقدس میں جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، وہ توحید کا اثبات اور شرک کا انکارونفی ہے۔سورہ اخلاص جوتہائی قرآن کے برابر ہے، یہ توحید کے اقراراور شرک کے انکار پر برہانِ قاطع کی حیثیت رکھتی ہے۔:

**(قل هو الله احد الله الصمد لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفوا احد )** یعنی اللہ تعالیٰ ایک ہے، وہ بے نیاز ہے۔اس کی کوئی اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد، اس کے مثل کوئی نہیں۔اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی سب سے مضبوط اورانتہائی آسان عقلی دلیل قرآن میں اس طرح پیش کی گئی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ: اگر زمین و آسمان میں چند معبود ہوتے تو نظامِ کائنات درہم برہم ہوجاتا۔کیوں کہ دو یااس سے زیادہ خدا ہونے کی صورت میں ان کی رائے میں کبھی نہ کبھی ضروراختلاف ہوتا اور دنیا کے نظام میں خلل واقع ہوجاتا اور ہزاروں لاکھوں سالوں سے اب تک دنیا کے نظام میں خلل واقع نہ ہونا اور ایک ہی طرح کے نظام کا دنیا میں برپا ہونا، اس بات کی مضبوط اور مستحکم دلیل ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک ایک اور صرف ایک ہے اور وہ اللہ رب العزت کی ذات پاک ہے۔

## شرک کی نفی :

(تعرف الاشیاء باضدادھا) شے اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہے۔توحید کی ضد شرک ہے۔توحید، اللہ تعالی کی ذات وصفات اور اس کی وحدانیت و ربوبیت کے اقرار کا نام ہے۔اسی سے شرک کا مفہوم بھی ہو گیا اور وہ یہ کہ ''اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کسی کو شریک ٹھہرانا شرک ہے''۔ قرآن مجید میں اعلانِ توحید کے ساتھ شرک کا انکار بھی بڑے شد و مد کے ساتھ کیا گیا ہے۔خصوصیت کے ساتھ وہ آیات جو مکّی ہیں، ان میں انکارِ شرک اور اس سے براءت و بیزاری کا اعلان کیا گیا ہے۔

**شرک کی مختلف قسمیں ہیں :** شرک فی الذات ، شرک فی الصفات ،شرک فی القدرت ،شرک فی الحکم ،شرک فی العلم ،شرک فی العبادت وغیرہ۔

شرک اعظم الکبائر یعنی گناہوں میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ ہر قسم کے صغائر و کبائر گناہ توبہ کے بعد رب کے فضل سے معاف ہو جاتے ہیں، لیکن شرک ایک نا قابل معافی جرم ہے ، جس کا کوئی کفارہ نہیں۔قرآن شریف میں آیا ہے:

(ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذالک لمن یشاء)

## صفاتِ باری تعالیٰ کا تذکرہ :

مذہبِ صحیح کے مطابق اسمِ جلالت ( اللہ عز و جل ) کی تعریف اس

طرح کی گئی ہے:

اللہ اس ذاتِ واجب الوجود کا علَم (مخصوص نام) ہے، جو تمام صفاتِ کمالیہ کا جامع ہے۔ یعنی وہ ہر وصفِ حسن کا جامع ہے، وصفِ قبح کا اتصال اس کی تقدیسی شان کے منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محالات وممتنعات قدرتِ الٰہیہ کے تحت داخل نہیں ہیں۔ (ان اللہ علی کل شئ قدیر) وہ ہر ممکن شے پر قادر ہے اور کذب چوں کہ ایک وصفِ قبیح ہے، اس لیے یہ اس کے تحتِ قدرت داخل نہیں۔

قدرت، ایجاد وتخلیق، علم، سمع، بصر، حکم وغیرہ، اللہ تعالیٰ کی صفاتِ ذاتیہ کمالیہ ہیں، جن کو بقا لازم ہے۔ ان کے لیے فنا نہیں۔

سید نور صاحب کے کلام میں توحید، شرک کی نفی اور صفاتِ باری تعالیٰ سے متعلق مختلف امور کا تذکرہ متعدد مقامات پر موجود ہے، جو ''قرآنی افکار کی ترجمانی'' کی ایک بہترین مثال ہے۔

## صفتِ ایجاد وتخلیق کا ذکر :

ہوا کو بادل بنانے والا مرا خدا ہے
زمیں پہ سبزہ اگانے والا مرا خدا ہے
ہے آب نیساں سے تشنگی کو بجھانے والا
صدف میں گوہر بنانے والا مرا خدا ہے
خدا ہے قادر جسے بھی چاہے بنا دے قادر
یہ سچ ہے مردے جِلانے والا مرا خدا ہے
خلش سے کانٹوں کی نور سونا جہاں ہو مشکل

وہاں بھی سب کو سلانے والا مرا خدا ہے

یہ پوری حمد، اللہ تعالیٰ کی ایجاد و تخلیق کے نوع بنوع تذکار پر مشتمل ہے۔

## صفتِ قدرت و ملکیت کا ذکر :

چاند میں نور تو پھولوں میں ہے رنگت تیری
وادیِ کن میں ہے بکھری ہوئی طلعت تیری
دھوپ تیری، ترے صحرا ہیں، مسافت تیری
حوصلہ بن کے رہے سایہ فگن چھت تیری
صحنِ گلزارِ نفَس تیری نمو سے تازہ
کوچہ فکر و تخیل میں ہے نزہت تیری
سب ہیں آسودہ ترے سفرۂ نعمت سے کریم
سب کو حاصل مرے رحمان ہے چاہت تیری
ساری خلقت پہ خدایا ہے حکومت تیری
شرکتِ غیر کہاں صرف ہے قبضہ تیرا
شرق سے غرب تلک اور زمیں سے تا عرش
جو بھی موجود ہے سب کچھ تو ہے مولیٰ تیرا
خشک و تر، برگ و شجر ہیں ترے محتاجِ کرم
اک سمندر بھی نہیں جو نہ ہو پیاسا تیرا

☆☆☆

## صفتِ عبودیت کا ذکر :

کون سی شے نہ ترے نام کی تسبیح پڑھے
کون عالم ہے وہ جس میں نہیں چرچا تیرا

## ازلی وابدی ہونا :

اللہ عز وجل ازلی وابدی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ اس کی قدرتِ کاملہ اور حاکمیتِ اعلیٰ کا یہ کرشمہ ہے کہ کائنات کا انتظام ایک خاص توازن کے ساتھ چل رہا ہے۔ عالم کا ذرہ ذرہ مصروفِ کار پردازی ہے، جس میں کسی طرح کا خلل اور بگاڑ نہیں ہے۔

علیٰ الدوام وجود و قیام ہے تیرا
نہ ابتدا ، نہ کوئی اختتام ہے تیرا
اک ایک ذرہ ہے مصروفِ کار پردازی
کچھ اس طرح سے منظّم نظام ہے تیرا
تو لا زوال ، تیرا ہنر لازوال ہے
تیری عطا یہ سارا جہانِ کمال ہے
ہر زندگی کو موت یقینی ہے اے خدا
تو ربِّ کائنات ہے ، تو لازوال ہے

جناب سید نور صاحب کی شاعری ( جیسا کہ اوپر بیان ہوا ) قرآن و حدیث سے ماخوذ شاعری ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں

بڑے حزم و احتیاط کے ساتھ کہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں قرآنی افکار کی جلوہ گری جا بجا نظر آتی ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے، جس پر صفحات کے صفحات لکھے جاسکتے ہیں۔

پروفیسر شمائلہ صدف صاحبہ اپنے ایک مضمون میں اس حوالے سے تحریر کرتی ہیں:

حضرت نور کی نعتیہ شاعری کی جاذبیت و دل آویزی کا ایک بڑا سبب وہ طیب و طاہر موضوعات ہیں جو قرآن و حدیث سے مقتبس (ماخوذ) ہیں، یعنی حضرت نور کے یہاں جذبات کی لطافتیں بھی ہیں اور تاریخی صداقتیں بھی، شعریت بھی ہے اور شریعت بھی۔ (ثنا کی نکہتیں۔ مجموعہ نعت بر زمین غالب) میں جا بجا قرآن و حدیث سے مقتبس موضوعات پوری آب و تاب سے جگمگاتے ہوئے بصارتوں اور بصیرتوں کو تابانی بخشتے ہیں۔

(ثنا کی نکہتیں، ص:۳۵، دبستان نوابیہ عزیزیہ، قاضی پور شریف)

اللہ رب العزت پوری کائنات کا خالق و مالک اور حاکم و رازق ہے۔ وہی سب کو رزق دیتا ہے۔ تمام مخلوقات اس کے خوانِ کرم سے رزق پاتے ہیں اور اس کے سفرۂ نعمت سے فیض اٹھاتے ہیں۔ اس مفہوم پر دلالت کرنے والی متعدد آیات قرآن مقدس میں موجود ہیں۔

سورہ ھود کی آیت نمبر:٦ میں ہے :

**( وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُستَقَرَّهَا وَمُستَوْدَعَهَا، كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِين۔**

اسی مفہوم کی ترجمانی کرتے ہوئے جناب نور کہتے ہیں:

سب ہیں آسودہ ترے سفرۂ نعمت سے کریم
سب کو حاصل مرے رحمان ہے چاہت تیری
سیراب کر رہا ہے جو کل کائنات کو
مولیٰ وہ تیرا قطرہ جود و نوال ہے

آیت کریمہ:(و ان من شیء الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم ) کے مطابق زمین وآسمان، بحر و بر، شجر و حجر، خشک و تر، غرض کہ کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتقدیس بیان کرتی ہے، لیکن ہم اس حقیقت کا ادراک نہیں کر پاتے۔

کلامِ نور میں اس قرآنی مفہوم کی ترجمانی یوں کی گئی ہے:

قطرہ قطرہ تری تسبیح میں مصروف رہے
موج در موج بیاں ہوتی ہے قدرت تیری

قرآن مقدس کے فرمان کے مطابق اللہ تبارک وتعالیٰ ''فعّال لما یرید'' ہے۔ یعنی وہ جو چاہتا ہے، اس کی مشیّت اور ارادے میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ اس کے امور ومعاملات کو سمجھنا، انسانی شعور وادراک سے ورا ہے۔ اس حوالے سے جناب نور یوں فکرِ سخن کرتے ہیں:

ہمارے فہم وخرد سے بعید اس کے امور
محال امر کو حل کرنا کام ہے اس کا

قرآن مجید، سورہ نساء، آیت نمبر : ۶۴ میں ہے :

(وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذ ظَّلَمُوا انفُسَھُمْ جَاءُ وکَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰہَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّہَ تَوَّابًا رَّحِیمًا)

ترجمہ : اور وہ لوگ جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اگر وہ آپ

کے پاس آتے اور اللہ سے بخشش و مغفرت کی دعا مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے بخشش کے دعا فرما دیتے تو وہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا نہایت مہربان پاتے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار گہر بار کو مجرموں اور گنہگاروں کو لیے عدالت بنایا ہے، وہاں سے جو فیصلہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ قبول ہو جائے گا۔ سید نور صاحب اسی قرآنی تصور کو اپنے مخصوص شاعرانہ لہجے میں یوں بیان کرتے ہیں:

مجرم کو اپنے تیری عدالت میں بھیج کر
واضح کیا خدا نے ترے اختیار کو

سبحان اللہ، ماشاءاللہ!!

مذکورہ بالا قرآنی مفہوم کی اس سے بہتر ترجمانی اور کیا ہو سکتی ہے۔

قرآن پاک کی سورہ والنجم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج شریف کی رات مقامِ قربِ خداوندی میں پہنچنے اور تجلیات الٰہی سے اکتسابِ فیض کرنے کا تذکرہ ان الفاظ میں آیا ہے:

(فکان قاب قوسین او ادنیٰ)

نور صاحب اسی بات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

پہنچے جب آغوشِ ''اوادنیٰ'' میں محبوبِ خدا
ختم سارا ہو چکا تھا فاصلہ قوسین کا

قربِ خداوندی اور مقامِ دنیٰ کی حکایت بیان کرتے ہوئے اس کی تعبیر ''آغوشِ اوادنیٰ'' سے کرنا، اس روحانی کیفیت کی بالکل شایانِ شان ہے، جو اعلیٰ درجے کی بلاغت ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب قرآن مجید کی سورہ فاتحہ کی آخری آیت میں اہلِ ایمان کو صراطِ مستقیم یعنی سیدھی راہ پر چلنے کی دعا کی تعلیم دی ہے۔

**( اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم و لا الضالین )**

یعنی ہمیں سیدھے راستے پر چلا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا انعام و اکرام ہوا، ان لوگوں کا راستہ نہیں جو راہِ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں اور جن پر تیرا غضب اور عتاب نازل ہوا۔

اس آیت کے تناظر میں سید نور صاحب اپنی ایک مناجات میں اللہ رب العزت سے یوں التجا کرتے ہیں:

اس کے سائے سے بچا جس پہ ہوا تیرا عتاب
اس سے محفوظ مجھے رکھ جو ہے مارا تیرا

اہل حق ہمیشہ آزمائے گئے ہیں اور آزمائے جاتے رہیں گے۔ یہی قدرت کا منشا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

**(اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ)**

(قرآن مجید، سورہ بقرہ، آیت: ۲۱۴)

ترجمہ: کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تمہیں وہ (حالات) پیش نہیں آئے جو ان لوگوں کو پیش آئے جو تم سے پہلے گزرے ہیں، انہیں سختی اور تکلیف پہنچی اور ہلا دیے گئے یہاں تک کہ رسول

اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے بول اٹھے کہ اللہ کی مدد کب ہوگی! سنو بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اہل حق کے ابتلاء و آزمائش میں مبتلا ہونے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

اس قرآنی فکر کی ترجمانی جناب سید نور صاحب اس طرح کرتے ہیں:

یہی ہے رسم محبت ازل سے تا امروز
جو اہلِ حق ہیں وہی آزمائے جاتے ہیں

## عارفانہ کلام:

صوفیانہ شاعری، شعر و سخن کی ایک مستقل قسم ہے جس میں تصوف کے مسائل اور طریقت کے مباحث ضمناً یا مستقلاً بیان کیے جاتے ہیں۔ حسرت موہانی نے محاسنِ سخن کے ضمن میں ''مسائلِ تصوّف'' کو بھی رکھا ہے۔ تصوّف و معرفت کے پاکیزہ مسائل سے بھی کلام میں حسن و دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم اساتذۂ سخن مثلاً: قلی قطب شاہ، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، خواجہ میر درد، میر تقی میر اور غالب وغیرہ کے دواوین و کلیات میں مسائلِ تصوّف کا اشاراتی بیان ملتا ہے۔

کسی بھی شاعر کے کلام کو سمجھنے اور ادبی و فنی لحاظ سے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے اس کی ذہنیت یا افتادِ طبع کا حال جاننا ضروری ہوتا ہے۔ جناب سید نور الحسن نور صاحب ایک دینی و علمی اور روحانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ تصوف و روحانیت شروع سے ان کے گھرانے کی زینت رہی ہے۔ ان کے آباء واجداد میں اکابر صوفیہ و مشائخ اور بڑے بڑے رجالِ

شریعت وطریقت گزرے ہیں۔ان کے والد گرامی سلطان العارفین، برہان الواصلین حضرت الحاج صوفی سید نوّاب علی شاہ حسنی جہاں گیری ابوالعلائی علیہ الرحمہ اپنے وقت کے بلند پایہ مرشد وصوفی، عارف باللہ اور خدا رسیدہ بزرگ تھے،جن کی زندگی وبندگی کا حال دیکھ کر اور سن کر صوفیائے متاخرین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔کہتے ہیں کہ انسان اپنے ماحول کا پروردہ ہوتا ہے۔سید نور صاحب چوں کہ خانقاہی ماحول میں پلے بڑھے ہیں اور تصوف آشنا خاندان میں نشو ونما پائی ہے، اس لیے شروع سے ان کے مزاج میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ تصوف ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔صوفیانہ اقدار وروایات کو اپنے سینے سے لگا کر زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ تصوف کا رنگ ان کے کلام میں نمایاں ہے۔جذبہ عشقِ رسول، اطاعتِ خداوندی،شریعت مطہرہ پر عمل کرنے کی تڑپ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے سانچے میں دوسروں کو ڈھالنے کی فکر،سوز وگداز اور جذبات کا التہاب، یہ ساری چیزیں ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں، جو ان کی تصوف آشنا طبیعت کی جانب غمّاز ہیں۔ان کے صوفیانہ وعارفانہ کلام میں تصوف وروحانیت کے مسائل بڑے سادہ اور آسان لہجے میں بیان کیے گئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کریں:

چاند میں نور تو پھولوں میں ہے رنگت تیری
وادیِ کن میں ہے بکھری ہوئی طلعت تیری

یہ شعر تصوف کی نہایت مشہور اور معرکہ آرا بحث ''وحدت الوجود'' کے وجود وثبوت پر دلالت کرتا ہے۔وقت اور صفحات کی قلت پیش نظر ہے، ورنہ یہاں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے فلسفے پر تفصیلی روشنی ڈالتا۔تصوف کا سب سے پہلا زینہ ریاضت اور سخت مجاہدے کا ہوتا ہے۔اس

میدان میں قدم رکھنے کے بعد مرشد اپنے مرید اور سالک کو پہلے نفس کُشی کی خاطر سخت ریاضت اور مجاہدہ کی تعلیم دیتا ہے۔ کیوں کہ جب تک نفس مردہ نہ ہو جائے، دل کی بنجر زمین میں طریقت و معرفت کے پھول نہیں کھِلتے۔ تصوف کے منجملہ مشاغل میں ''نفس کشی'' سب سے زیادہ اہمیت و وقعت رکھتا ہے۔ نفسانی خواہشات کے ہوتے ہوئے سلوک و تصوف کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس حوالے سے سید نور صاحب نے کیا ہی خوب عارفانہ شعر کہا ہے:

مجھ کو تسخیرِ دو عالم کی نہیں کچھ حاجت
میرے اللہ ! مرا نفس مسخّر کر دے

تصوف کی کتابوں میں توحیدِ الٰہی اور معرفتِ خداوندی کی بحث بھی دیکھنے کو ملتی ہے، جس میں اس راہ کے مسافر کو توحید و معرفت کی منزل تک رسائی کے آداب بتائے جاتے ہیں۔

توحید و معرفت کیا ہے اور اس کا رازداں کون ہے؟ اس سوال کا جواب سید نور صاحب نے کیا ہی خوب دیا کہ:

توحید و معرفت کا وہی رازداں رہے
جو بھی غریقِ عشقِ شہِ دوجہاں رہے

یعنی صرف نبی کونین علیہ التحیۃ والتسلیم سے عشق و محبت کا دعویٰ کرنے سے یہ مقام حاصل نہیں ہوتا، بلکہ ''فنا فی الرسول '' کی حد تک عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں غرق ہونے کے بعد یہ مقام و منصب عطا ہوتا ہے۔

اربابِ تصوّف نے اپنے ذوق و وجدان کے مطابق الگ الگ طریقے سے تصوف کی سینکڑوں تعریفیں بیان کی ہیں، لیکن وہ تعریف جس میں کہا گیا ہے کہ ''تصوّف دراصل اتبّاعِ شریعت کا نام ہے''، سب سے جامع

تعریف ہے۔ سید نور صاحب نے تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار میں طریقت و معرفت کے بڑے اہم اور گراں قدر مسائل بیان کر دیے ہیں۔

اسوۂ رحمتِ عالم پہ جو کر لوگے عمل
ایک دن دیکھنا ٹھوکر میں زمانہ ہوگا

تو ان کی غلامی کی سند کر لے جو حاصل
رکھ دے گی جبیں دولتِ عقبیٰ ترے آگے

سلطانیٔ عالم بھی کوئی چیز نہیں ہے
اے دولتِ عشقِ شہِ بطحا ترے آگے

ہو قلب اگر جلوہ گہہِ رحمتِ عالم
خود کھنچ کے چلا آئے گا کعبہ ترے آگے

ہر ملک ترے زیرِ نگیں جس کے سبب تھا
وہ عشقِ شہِ دیں کا سبب بھول گیا کیا

کہاں ہوتی میسر منزلِ قربِ خداوندی
چراغِ راہ جو آقا کا نقشِ پا نہیں ہوتا

ہو جائے گی اطاعتِ پروردگار بھی
دل سے جو مصطفیٰ کی اطاعت کریں گے ہم

عشقِ سرکارِ دوعالم میں فنا ہو جانا
زندگی تیرا ہے محرومِ قضا ہو جانا

☆☆☆

# مصنف کی چند اہم تصانیف

علامہ سید سلیمان اشرف بہاری: اہل علم کی نظر میں

موبائل فون کے ضروری مسائل

تذکرہ شعرائے بھاگلپور

قربانی صرف تین دن

فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین بہار

چالیس احادیث قدسیہ

تذکرہ سرکار شبلی باڑی

بھاگلپور کے نعت گو شعراء

ملاّ احمد جیون امیٹھوی: حیات و خدمات

اسلام اور شجرکاری

تذکرہ مفتی ظل الرحمٰن بھاگلپوری

علامہ سید سلیمان اشرف بہاری (ادیب محقق اور ناقد)

Kalam-e-Noor

KE ADABI MAHASIN

Mohammad Tufail Ahmad Misbahi